جلد ۸۳ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۵۹ء نمبر ۳

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ دو مہینوں میں دنیائے علم وادب کی دو نامور شخصیتیں پروفیسر محمد الیاس برنی اور خلیفہ عبدالحکیم ہم سے جدا ہوگئے، پروفیسر الیاس برنی علی گڑھ کالج کے نامور فرزند تھے، حصول تعلیم کے بعد کالج ہی میں معاشیات کے لکچرار ہوگئے تھے، پھر دار الترجمہ کے رکن کی حیثیت سے حیدرآباد چلے گئے اور کچھ دنوں تک اس کے ناظم بھی رہے، پھر جامعہ عثمانیہ میں معاشیات کے استاد مقرر ہوگئے، اور اسی عہدہ سے سبکدوش ہوئے، تعلیم وتدریس کے ساتھ تالیف وتصنیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، جامعہ عثمانیہ کے لیے معاشیات کی کئی کتابیں لکھیں، اس فن کو اردو میں سب سے پہلے ان ہی نے روشناس کیا تھا، ان کی پہلی تصنیف علم المعیشت ایک زمانہ میں بہت مشہور تھی، شعروادب کا مذاق بھی رکھتے تھے، معارف ملت، جذبات فطرت اور مناظر قدرت کے نام سے کئی حصوں میں اردو نظموں کا ایک نہایت عمدہ انتخاب مرتب کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا،

مذہبی ذوق ابتدا سے تھا، جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا، اور آخر میں مذہب وتصوف کا بڑا غلبہ ہوگیا تھا اور ان کی ساری قلمی کوششیں اسی کے لیے وقف ہوگئی تھیں، انھوں نے مختلف مذہبی موضوعوں پر مفید کتابیں لکھیں، ان کا سفرنامۂ حج، صراط الحمید خاص طور پر مقبول ہوا، قادیانی مذہب کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے قادیانی اکابر کی تحریروں سے اس مذہب کی حقیقت ظاہر کی گئی تھی، یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے اور ہر اڈیشن پہلے اڈیشن سے بڑھکر تھا، ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم ودین کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

خلیفہ عبدالحکیم ایک بالغ نظر فلسفی اور ممتاز صاحب علم وقلم تھے، وہ بھی جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، مذہب پر بھی انکی نگاہ تھی، اور شعروادب کا بھی ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اقبال کے فلسفہ اور کلام کے بڑے عارف اور اس کے نہایت اچھے شارح وترجمان تھے، جامعہ عثمانیہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور میں اقبال کی یادگار میں ایک ادارہ اقبال اکیڈمی قائم کیا تھا، اور اقبال کے نام سے ایک بلند پایہ علمی رسالہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکالتے تھے، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بھی بانیوں میں اور اس کے رکن رکین تھے، اسکا رسالہ ثقافت بھی ان ہی کی ادارت میں نکلتا تھا، انکا علمی مذاق نہایت بلند تھا، اور انکی پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گذری، انھوں نے فلسفہ، ادب اور مذہب پر نہایت قابل قدر کتابیں لکھیں، ان کی دو کتابیں فکر غالب اور افکار اقبال خاص طور سے اہم ہیں، مگر ان کے خیالات میں تجدد کا اثر تھا اس لیے مذہبی تعلیمات کی ترجمانی میں ان سے غلطیاں ہوئیں، لیکن ان کی نیت نیک اور ان کے دل میں مذہب کا درد تھا اور ان کی کتابیں ایک طبقہ کے لیے مفید بھی ہیں، اس حیثیت سے انھوں نے مذہب کی بھی خدمت کی، اللہ تعالیٰ انکی علمی لغزشوں سے درگذر، ان کی خدمت کو قبول اور انکی مغفرت فرمائے، اب ایسے خالص اہل علم مشکل سے پیدا ہوں گے۔

بنگال میں کلکتہ ہمیشہ سے اردو زبان وادب کا ایک مرکز رہا ہے، بلکہ اسکی تعمیر ہی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی ہے، اس لیے ہر دور میں یہاں شعروادب کا چرچا رہا، جو اب بھی قائم ہے، اور اردو شعروادب سے دلچسپی رکھنے والی ایک جماعت وہاں موجود ہے، انجمن ترقی اردو کی شاخ بھی قائم ہے، اس کے زیر اہتمام ۲۸ فروری، یکم اور ۲ مارچ کو کلکتہ میں بڑے پیمانہ پر ایک اردو کانفرنس ہوئی، اور اس سلسلہ میں ہند وپاک مشاعرہ بھی ہوا، اجتماع کی حیثیت سے یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی، ہندوستان کے بہت سے مشہور شعرا اور ادیبوں نے شرکت کی، اور یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ بنگال یا کم سے کم کلکتہ میں اردو زبان کے ساتھ کوئی تعصب نہیں ہے، اور یہ سنکر حیرت ہوئی کہ مشاعروں سے مارواڑی تاجر بڑی دلچسپی لیتے ہیں،

کانفرنس کا افتتاح مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی سی رائے نے کیا تھا، اگرچہ وہ صاف اردو نہیں بول سکتے لیکن یہ قابل تعریف ہے کہ جیسی بھی بولتے ہیں اردو ہی میں تقریر کی اور بنگال میں اردو کے جائز حقوق کے تحفظ کا پورا وعدہ کیا، گو عمال حکومت کے زبانی وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن کلکتہ کے اردو کے کارکنوں سے معلوم ہوا کہ ان کو اردو سے کوئی تعصب نہیں ہے، اور وہ جو وعدہ کرتے ہیں، اس کو پورا بھی کرتے ہیں، کانفرنس کے صدر پنڈت سندر لال کی تقریر حسب معمول بڑی پر درد اور موثر تھی، اور اسکی مجلس استقبالیہ کے لائق صدر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا خطبہ استقبالیہ بھی پر مغز تھا،

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ایک ہمارے صوبہ کی حکومت ہے، اردو کے بارہ میں جس کا کوئی وعدہ بھی آجتک شرمندۂ ایفا نہ ہوا اور کسی اردو کانفرنس میں اس کے وزیر اعلیٰ کی شرکت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت اس میں اردو کے کارکنوں کا بھی کم قصور نہیں ہے، ادھر عرصہ سے اردو کی تحریک کی رفتار بہت سست پڑ گئی ہے، خصوصاً مرکزی حکومت کی وزارت خارجہ کے اعلان کے بعد ان کی سرگرمی بالکل سرد ہو گئی ہے، اور اب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اعلان محض بہلانے کے لیے تھا، اور اس کا مقصد ہی خوبصورتی کے ساتھ اس تحریک کو کمزور کرنا تھا، ورنہ اس اعلان کو مہینوں ہو گئے اور اب تک اس کا کوئی عملی نتیجہ ظاہر نہ ہوا، درحقیقت اس مسئلہ میں اتر پردیش اور مرکزی حکومت کے رویہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا، اور اب محض تحریروں، تقریروں اور تجویزوں سے کام چلنے والا نہیں ہے، اور پہلے سے زیادہ عملی جد و جہد بلکہ اگر ضرورت پڑے تو تیز قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے اردو تحریک کے رہنما جو صورت بھی تجویز کریں، اس کے بغیر اردو کی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ ختم نہ ہو جائے۔

~~~~~~~~~~o~~~~~~~~~~

مقالات

فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر

فقہ کی اصل حقیقت اور مفہوم میں بتدریج تنگی

از مولانا محمد تقی امینی صدر دار العلوم معینیہ درگاہ شریف، اجمیر

(۲)

قانون روما کے ماخذ کی تفصیل اس موقع پر قانون روما کے ماخذ کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہوگا، رفتہ رفتہ اس کے حسب ذیل ماخذ بن گئے تھے،

(۱) ایک کتاب جس میں بیشتر مذہبی امور کے متعلق قانون درج تھے، اس کا نام جس کیویلے پاپیریانس (Jus Cvile Papitianun) ہے[1]، ان ہی مذہبی قواعد کو فاس (Fas) کہتے تھے،

(۲) فقہا و مجتہدین کے فتاوی۔

(۳) یہ فقہاء تین جماعتوں میں منقسم کیے گئے ہیں،

(۱) احبار اور فقہائے سلف قانون مندرجہ "دوازدہ الواح" کی تشریح کرتے تھے، ان کی اس تشریح و توضیح سے آگے چل کر بالکل نئے قواعد کا ایک بہت

---

[1] خصوصی قانون روما ص ۵

بڑا مجموعہ ترقی پا گیا تھا،

(۲) فقہائے متقدمین۔ متاخرین سے ممیز کرنے کے لیے انھیں متقدمین کہا جاتا ہے، ان کے درج ذیل کام کی نوعیت سے ان کی حیثیت تقریباً وکلا جیسی معلوم ہوتی ہے، مثلاً (۱) قانونی معاملات سے متعلق سوالات کے جواب دینا (۲) مقدمہ کی ابتدائی منازل میں موکل کے مفادات کی نگہداشت کرنا (۳) عدالت میں مقدمہ کی پیروی کرنا (۴) ایک یہ کام بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات قانونی رسالوں کی تالیف کرتے تھے اور بعض خاص صورتوں میں تحریری فتویٰ بھی دیتے تھے، لیکن زیادہ تر وہی کام سپرد تھے جو پہلے بیان ہوئے ہیں۔

(۳) مستند مجتہدین۔ یہ فقہاء مستند اصول قانون کے زمانہ کے ہیں، یہ زمانہ دوسری صدی عیسوی کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے، ان کے حسب ذیل کام تھے، (۱) رومی قانون کی ترقی (۲) مجموعہ قوانین میں تطبیق کی صورت پیدا کرنا (۳) قانون کی تشریح جدید کرنا اور حالات کے مناسب نئے قالب میں ڈھالنا،

(۴) اعلیٰ ترین مجلس وضع قوانین۔ اس میں بادشاہ اور اس کی خصوصی مجلس شامل تھی،

(۵) مجلس عوام۔ اس میں شرفاء اور عوام دونوں شامل تھے، یہ مجلس دراصل اس تقسیم پر مبنی تھی جو رومی باشندوں کی اضلاع کے لحاظ سے کی گئی تھی،

(۶) تجاویز سینات (Senate) (مجلس اکابرین) قانون کے بارے میں قونصل سینات کے غور کے لیے اپنی تجاویز پیش کرکے ان کی رضامندی سے جاری کرتا تھا، یہ مجلس رومی قبائل کے اکابرین سے تشکیل پاتی تھی اور اس کا کار منصبی بادشاہ کو نامزد کرنا اور اس کو مشورہ دینا تھا، بعد میں شہنشاہ کی محکوم بن گئی تھی،

(۷) فرامین شاہی۔ گذشتہ صورتوں کو بھی حاوی ہے،

(۸) مجسٹریٹ کے اعلانات وجرائد جو وقتاً فوقتاً وقتی یا دوامی (تا مدت خدمت) رنگ میں جاری ہوتے تھے۔

(۹) رسم و رواج۔ یہ سب سے قدیم ماخذ ہے اور ہر دور میں اس کا وجود موجود رہا ہے۔[1]

قانون روما کے ماخذ میں قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا ایک حصہ مذہبی ہے، اس طرح مذہبی قوانین کے اجزاء لازمی طور سے اس میں شامل ہیں، جیسا کہ تفصیل پہلے گذر چکی۔

فقہ اسلامی کے ماخذ کی تفصیل یہ ہے:

(۱) قرآن حکیم

فقہ اسلامی کا اصل الاصول ماخذ قرآن حکیم ہے

فقہ اسلامی کا اصل الاصول ماخذ قرآن حکیم ہے، یہ اصول وکلیات کی کتاب ہے، اس میں الٰہی پالیسی اور دستور (Canstitution) سے بحث ہے، جزوی قوانین کی تفصیل بہت کم ہے،

قرآن حکیم چونکہ الٰہی سلسلۂ ہدایت کا آخری ایڈیشن ہے، اس بنا پر اس کی تعلیمات و تفہیمات کا ہر دور اور ہر زمانہ میں یکسانیت کے ساتھ پایا جانا لازمی تھا، یہ بات اسی صورت میں ہوسکتی تھی کہ ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ بتا کر اس کے خطوط کھینچ دیے جاتے، سرحد پر سنگ نشان کھڑے کر دیے جاتے اور ان میں رنگ بھرنے کا کام حال اور زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں پر چھوڑ دیا جاتا اور ہر دور میں بتائی ہوئی پالیسی کے مطابق متعینہ حدود وخطوط پر عمارت کی تعمیر ہوتی رہتی، اس طرح دائرہ کے نقطہ کی طرح قرآنی اصول وکلیات اور اوامر ونواہی اپنی جگہ ثابت وقائم رہتے اور اس کی تعبیر نیز عملی شکل میں متشکل کرنے کی صورتیں ارتقا پذیر معاشرہ کے ساتھ بدلتی رہتیں، اور اگر ابتدا ہی میں ساری جزئیات بیان کر دی جاتیں اور عملی شکل کے سارے

[1] حوالۂ بالا ص ۳۴

خاکے تیار کر دیے جاتے تو ایک تو اس کی دستوری پوزیشن نہ باقی رہتی اور دوسری بڑی بات یہ ہوتی
کہ اس کی دوامی اور عالمگیر حیثیت ختم ہو جاتی اور ساری تعلیم مخصوص زمانہ تک محدود ہو کر رہ جاتی
اور پھر اس میں جمود و تعطل پیدا ہو کر ارتقاء پذیر معاشرہ کو سمونے اور اقتضاء و مصالح کو انگیز کرنے کی
ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتیں،

قرآن حکیم الٰہی پالیسی اور بنیادی اصول کی کتاب ہے، اس میں جزئیات کی بحث بہت کم ہے

مثال کے طور پر قرآن حکیم نے حکومت کی نوعیت اور پالیسی متعین
کر دی کہ وہ زمین میں اللہ کی نیابت و امانت ہوگی اور زیادہ سے
زیادہ الٰہی صفتوں کو اپنے اندر جذب کر کے عدل و مساوات کے اصول پر خلق کے مادی و روحانی
فوائد کا بند و بست کرے گی اور یہ بات بھی بتا دی کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے شورائی نظام
ہوگا، اس کے علاوہ اس سلسلہ میں اور جو باتیں بنیادی حیثیت کی تھیں ان کی وضاحت کر دی،
لیکن تفصیل نہیں بتائی کہ شورائی نظام کا انعقاد کس طرح ہو؟ حکومت موجودہ طرز کی جمہوری ہو
یا شاہی؟ آمرانہ ہو یا فوجی ڈکٹیٹر شپ؟ رائے عامہ معلوم کرنے کی کیا صورت ہو؟ غرض طریق کار
کی جزئیات سے قرآن نے تعرض نہیں کیا، کیونکہ اسکو اصل بحث مقصد اور مقصد تک پہنچنے کے بنیادی
اصول سے ہے، اسکے ذرائع اور طریق کار کیا ہوں؟ اس کا فیصلہ حالات و زمانہ پر چھوڑ دیا ہے، ان
الجھاؤ میں پڑنے کے لیے نہ قرآن حکیم نازل ہوا ہے اور نہ ہی اس سے اس کی توقع رکھنی چاہیے،
قرآن حکیم کا مقصد اس کے بنیادی اصول پر عمل کر کے جس قسم کے طریقۂ کار اور جیسے نظام
حکومت سے حاصل ہوگا وہ قرآنی حکومت ہوگی، موجودہ دنیا چاہے اس کا جمہوریت نام رکھے
یا آمریت، افراد کی رائے شماری سے یہ کام لیا جائے، یا کسی اور طریقے سے،

اس بارے میں فقہاء و صلحائے امت نے جزئیات کی تفاصیل بتا کر جو کارہائے نمایاں
انجام دیے ہیں وہ سب اپنے اپنے زمانہ کے حالات کی مناسبت سے تھے اور آج بھی ہیں

حق ہے کہ ان جزئیات کی روشنی میں مقصد اور اصول کے پیش نظر اپنے زمانہ کے حالات و تقاضا کے
مناسب طریقۂ کار کی جزئیات مرتب اور مدون کریں، اس مرتب شدہ جزئیات کی حیثیت بھی
پہلی جزئیات کی طرح قطعی اور دوامی نہ ہوگی بلکہ معاشرہ کی حالت پر موقوف ہوگی اور اسی وقت
تک باقی رہے گی جب تک معاشرہ اجازت دے گا۔

دراصل طریقۂ کار کا تعین بڑی حد تک عوامی شعور، یا بقول "ہیگل" عوامی روح پر موقوف
ہے نہ کہ کسی ملک کی نقالی پر، اس لیے جب کبھی عوامی شعور کی حالت میں تبدیلی ہوگی یا عوامی
روح کروٹ بدلے گی، تو لازمی طور سے پرانے طریقۂ کار پر نظر ثانی کرنی پڑے گی،

فقیہ کے لیے قرآن حکیم سے متعلق اصول فقہ کی تشریحات کا جاننا ضروری ہے

فقہاء نے قرآن حکیم کے اسی حصہ سے بحث کی ہے جس کا تعلق
فقہی احکام سے ہے اور یہ حصہ متفرق پانچ سو آیتوں کے قریب
ہے، اس سے متعلق حسب ذیل قسم کی باتوں کا جاننا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

(۱) ناسخ و منسوخ۔ کون سی آیت ناسخ ہے اور کونسی منسوخ،

(۲) مجمل و مفسر۔ کون مجمل ہے اور شرح و تفسیر کے لیے کونسی آیت ہے۔

(۳) خاص و عام۔ اپنے مفہوم کے اعتبار سے کونسی آیت خاص ہے اور کون عام ہے،

(۴) محکم و متشابہ۔ کونسی آیتیں عملی زندگی میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں،
اور انسانی عقل واضح طور پر ان کا ادراک کر سکتی ہے، اور کونسی ایسی ہیں جن کا تعلق ایمانیات
ہے اور ان کے حقایق ماورائے عقل ہیں، جن کا ادراک اخص الخواص ہی کر سکتے ہیں،

(۵) اسی طرح اس بات کا علم بھی ضروری ہے کہ عمل میں لانے کی جو باتیں ہیں وہ کس درجہ
کی ہیں، فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ، اور نہ کرنے سے متعلق جو ہیں ان کی کیا نوعیت ہے،
حرام، مکروہ وغیرہ،[1]

[1] عقد الجید ص ۶

فقہائے ان کے علاوہ اور جو تشریحات کی ہیں اور استدلال و استنباط کے جو طریقے مقرر کیے ہیں، وہ بھی نہایت اہم ہیں، اور ایک مجتہد و فقیہ کے لیے ان سے واقفیت حاصل کرنا بھی بڑی حد تک ضروری ہے۔

چند مبادیات کی تفصیل اور نزول قرآن کے مقاصد

اس سلسلہ کی پوری تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں ملے گی، یہاں ہم چند مبادیات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جو فقہا کے پیش نظر تھیں اور فقہ کی تدوین کے لیے ان کی رعایت ضروری ہے،

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی صورت میں جن تفہیمات و تنقیحات کو پیش کر رہے تھے، وہ تکمیلی مرحلہ میں کتنی ہی نئی کیوں نہ ہوں لیکن جہاں تک ان کی بنیادی تعلیم کا تعلق ہے ان میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جن سے لوگ بالکلیہ نا آشنا ہوں، اس بنیاد پر نزول قرآن کے حسب ذیل مقصد نکلتے ہیں،

(۱) ہدایت الٰہی کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا، اس کی تکمیل کرنا۔

(۲) جس حصہ میں زیادتی یا کمی کر دی گئی تھی اس کو واضح کرنا۔

(۳) جسے بھلا دیا گیا تھا اسے یاد دلانا۔

(۴) جن بندشوں میں لوگوں نے اپنے کو غلط طریقے سے جکڑ لیا تھا ان سے نجات دلانا۔

جیسا کہ قرآن حکیم میں بیان کیے ہوئے مقاصد سے مذکورہ بیان کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

(۱) یامرھم بالمعروف — وہ لوگوں کو "معروف" کا حکم دیتا ہے،

(۲) ینھھم عن المنکر — "منکر" سے روکتا ہے،

(۳) یحل لھم الطیبات — "طیبات" کو لوگوں کے لیے حلال کرتا ہے

(۴) یحرم علیھم الخبائث — "خبائث" کو ان پر حرام کرتا ہے،

(۵) یضع عنھم اصرھم — اس بوجھ سے نجات دلاتا ہو جس کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔

(۶) والاغلل التی کانت علیھم (۷/۱۵۷) — ان بیڑیوں کو ہٹاتا ہے جن میں وہ گرفتار تھے۔

معروف اور منکر کی تشریح

"معروف" سے مراد جانی پہچانی ہوئی چیزیں اور "منکر" سے وہ جن کا انکار کیا گیا ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی شمع ہمیشہ مسلسل روشن رہی ہے، اس لیے تاریخ کے ہر دور میں بڑی حد تک زندگی کے اخلاقی اقدار کا تصور بھی پایا جاتا رہا ہے، مخرب اخلاق چیزوں سے بھی ایک حد تک لوگ آشنا رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اغراض و ہوس کے غلبہ کی وجہ سے عمل چھوٹ گیا ہو اور بیرونی چیزوں کی آمیزش سے اصل پر نقل کا غلاف چڑھ گیا ہو،

عرب کے حالات اس سلسلہ میں زیادہ روشن اور واضح ہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں اور سیدنا موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے ماننے والوں سے اس کی کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اخلاق کی اہمیت اور مکارم اخلاق سے بالکل ناواقف رہے ہوں، اس بنا پر مذکورہ "معروف" سے حسب ذیل چیزیں مراد ہوں گی،

(۱) وہ مکارم اخلاق جو عرب میں یا دنیا کے کسی بھی خطہ میں موجود تھے،

(۲) آسمانی شریعتوں کی بہت سی بچی کھچی باتیں جو الٰہی پالیسی کے مطابق تھیں،

(۳) مراسم و رواج اور وہ ملکی قانون جو فطرت سلیمہ اور عقل کے مطابق تھے۔

اسی طرح "منکر" میں تمام وہ باتیں داخل تھیں جو مذکورہ باتوں کی ضد یا ان کے خلاف تھیں، مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ نے معروف کی تعریف میں نہایت دقیق اور نکتہ کی بات کہی ہے،

والمعروف ما حسنہ الشرع والعقل[1] — معروف وہ ہے جس کی شرع اور عقل تحسین کرے۔

---

[1] احکام القرآن

اس تصریح کی بنا پر ہر دور اور ہر زمانہ کے رسم و رواج اور ملکی قانون وغیرہ میں جو باتیں بھی عقل اور شرع کے خلاف نہ ہوں وہ سب "معروف" میں داخل سمجھی جائینگی قرآن حکیم کی اس تعبیر میں بڑی وسعت اور گنجائش ہے، جس سے ملک کے قانون اور اچھے رسوم کی قدرشناسی اور حوصلہ افزائی کا ثبوت ملتا ہے،

امام ابوبکر رازی[۱] نے زندگی کی تمام جہات کے لیے اس کلمہ کو جامع قرار دیا ہے،

كلمة جامعة لجميع جهات الامر بالمعروف[۱]	یہ کلمہ امر بالمعروف کی تمام جہتوں کو جامع ہے،

اور الٰہی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے خلق خدا کی ملکی و قومی تمام مصلحتوں اور فلاح و بہبود کے کاموں کو شامل ہے، اس کے عمومیت کی مختصر تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول ہے

التعظيم لامر الله والشفقة على خلق الله[۲]	امر بالمعروف سے مراد اللہ کے امر کی تعظیم اور اللہ کی مخلوق پر شفقت

حکومتی اور قانونی سطح پر اس مختصر حکیمانہ ارشاد کا مفہوم نہایت وسیع باب کھولتا ہے، اور غور و فکر کے لیے اقتضاء و مصالح کی نئی نئی شکلیں سامنے لاتا ہے،

طیبات اور خبائث کی تشریح

"طیبات" اور "خبائث" کا مفہوم بھی چند مخصوص جزئیات میں محصور نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی طبیعت سلیمہ کو مدار بنا کر اصول کے تحت مفسرین سے عمومیت ہی منقول ہے، مثلاً

المراد من الطيبات الاشياء المستطابة بحسب الطبع[۳]	طیبات سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو طبیعت سلیمہ کے اعتبار سے طیب اور پاکیزہ سمجھی گئی ہوں،

۱؎ تفسیر کبیر جزو دوم ص ۳۰۲ ۲؎ حوالۂ بالا ۳؎ حوالۂ بالا اور حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی ص ۲۵۷

خبائث کے بارے میں ہے :-

كل ما يستخبثه الطبع ويستقذره النفس كان تناوله سبباً للالم	تمام وہ چیزیں جنکو طبیعت سلیمہ خبیث اور گندی سمجھے اور نفس اسکو پلید جانے ایسی چیزوں کا استعمال [illegible]

مذکورہ تعبیرات میں ایک بنیادی حکمت کی طرف اشارہ ہے

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تعبیرات ایک ایسے سماج اور معاشرہ میں اختیار کی جارہی ہیں جو بگاڑ کی انتہا کو پہنچ چکا تھا، اگر ان کے یہاں زندگی کے بنیادی اقدار کا تخیل نہ موجود ہوتا اور وہ طبیعت اور فطرت سلیمہ کے معیار سے نا آشنا ہوتے تو ان تعبیرات سے اور زیادہ گمراہی و غلط فہمی کا اندیشہ تھا، یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس تشریح و توضیح کے لیے موجود تھے، پھر بھی ایک خالی الذہن معاشرہ کو مخاطب کرنے کے لیے مذکورہ تعبیرات مناسب نہیں قرار دی جاسکتی ہیں اور ایسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے کہ وہاں کے لوگ ایک مدت تک فطرت و طبیعت کی سلامتی کے معیار سے واقف ہوں اور اس کے خد و خال ابھار دینے اور تھوڑی سی توجہ دلانے سے کما حقہٗ واقف ہوجائیں، پھر وہ خود ہی اس قابل بن جائیں کہ اس کے نوک پلک درست کرلیں،

اصر اور اغلال کی تفسیر

"اصر" اور "اغلال" کے مفہوم میں تمام وہ احکام و اعمال داخل ہیں، جن میں دشواری ہو اور معمول سے زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑے[۱]، مولانا ابوالکلام نے اس کے ضمن میں درج ذیل باتیں لکھی ہیں،

"یہ بوجھ کیا تھے؟ یہ پھندے کون سے تھے؟ جن سے قرآن نے رہائی دلائی، قرآن نے دوسرے مقامات پر انھیں واضح کردیا ہے، مذہبی احکام کی بیجا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی

۱؎ نور الانوار ص ۱۷۱

تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں، جنھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے، پیغمبرؐ اسلام کی دعوت نے ان سے نجات دلائی، اس نے سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھادی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں" حنیفیۃ السمحۃ لیلھا کنھارھا"[1]

نزول قرآن سے متعلق مذکورہ بیان کی حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان سے تائید

نزول قرآن سے متعلق مذکورۂ بالا تشریحات کی تائید حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بالملۃ الحنیفیۃ الاسماعلیۃ (التی شاعت فی العرب) لاقامۃ عوجھا وازالۃ تحریفھا واشاعۃ نورھا وذالک قولہ تعالیٰ ملۃ ابیکم ابراھیم ولما کان الامر علی ذالک وجب ان تکون تلک الاصول مسلمۃ و سننھا مقررۃ لان النبی اذا بعث الی قوم فیھم بقیۃ سنۃ فلا معنی لتغیرھا و تبدیلھا بل الواجب تقریرھا لانہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسماعیلی ملت حنیفی لیکر بھیجے گئے تھے (جو عرب میں جاری تھی) اس کے ٹیڑھے پن کو سیدھا کرنے کے لیے، اس کے بگاڑ کو دور کرنے کے لیے اس کی روشنی کو پھیلانے کے لیے قرآن حکیم کے اس قول ملۃ ابیکم ابراھیم کا یہی مطلب ہے، جب معاملہ کی نوعیت یہ ہے تو ضروری ہے کہ ملت ابراہیمی کے اصول مسلّم رہے ہوں اور اس ملت کے طریقے میں ثابت ہوں کیونکہ پیغمبرؐ جب کسی ایسی قوم میں آتا ہو جن میں پہلی شریعت کے کچھ طور طریقے باقی ہوتے ہیں جن میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ پیغمبرؐ

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۹

اطوع لنفوسھم واثبت عند الاحتجاج علیھم[1]

ان طریقوں کو قائم رکھتا ہے یہی صورت لوگوں کی طبیعتوں کیلیے زیادہ خوشگوار ثابت ہے اور اسی کے ذریعہ ان پر حجت قائم ہوتی ہے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

" زمانۂ جاہلیت (رسول اللہؐ کے زمانہ) میں لوگ انبیاء کی بعثت کے جواز کو تسلیم کرتے تھے، جزا و سزا کے قائل تھے، نیکی و بھلائی کے اصول پر اعتقاد رکھتے تھے، ارتفاقات ثانی و ثالث کے ساتھ معاملہ کرتے تھے، البتہ دو گروہ ان میں پیدا ہو گئے تھے، ایک فساق کا اور دوسرا زنادقہ کا. فساق پر حیوانیت اور بربریت کا غلبہ تھا، اور زنادقہ کی ذہنی و فکری زندگی مسخ ہو گئی تھی۔[2]

ایک اور موقع پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

وکثیرا ما یستدل ھذا النبی فی مطالبۃ بما بقی عندھم من الشریعۃ الاولی[3]

بسا اوقات آنے والا نبی اپنے مفہوم و مطالب کی وضاحت میں پہلی شریعت کی جو چیزیں باقی رہ گئی ہیں ان سے استدلال کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں مختلف نبیوں کے تذکرہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتدا اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

فبھداھم اقتدہ (۶/۹۱) ان کی ہدایت کی آپ بھی پیروی کیجیے،

غرض رسول اللہؐ نے اس طرح الٰہی پالیسی اور بنیادی اصول کی روشنی میں پرانی موجود چیزوں اور نئی توضیحات کو سامنے رکھکر حالات و زمانہ کے مناسب ایک نئی شریعت

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۴۴، ۱۲ [2] حوالہ بالا [3] حوالہ بالا ص ۹۰

کی تکمیل فرمائی تھی،

معاشرتی اور سماجی حالات کے لحاظ سے قرآنی احکام دو حصوں میں منقسم ہیں

(۲) معاشرتی اور سماجی حالات کے لحاظ سے قرآنی تصریحات دو بڑے حصوں میں منقسم ہیں،

(۱) قوم ابھی ابتدائی مرحلہ سے گذر رہی تھی، نہ اس کی ٹھیک تنظیم ہو پائی تھی اور نہ اس کا اخلاقی شعور ابھی بیدار ہوا تھا، ایسی حالت میں صرف چند بنیادی عقاید و اعمال کی ضرورت تھی جو بڑی حد تک ان میں مشترک اور وہ ان سے مانوس ہوں تاکہ فکری و عملی انتشار ختم ہو کر قوم میں ہمدردی و مرکزیت کی روح پیدا ہو، پھر ایک مقصد و مرکز کے ماتحت متحد ہو کر آگے کے مراحل طے کریں، اس کے علاوہ ترغیب و ترہیب سے متعلق چند مسلم واقعات کا تذکرہ بھی ضروری تھا، جن سے عبرت و نصیحت حاصل ہو اور وہ اندھی تقلید کے بجائے تنقیدی شعور سے کام لینا سیکھیں اور توہم پرستی سے نکل کر حقیقت کو پہچانیں، اس ابتدائی مرحلہ میں قرآن حکیم کا جو حصہ نازل ہوا وہ توحید و رسالت، جزا و سزا اور مکارم اخلاق وغیرہ کے بیان پر محدود ہے، اس سلسلہ میں جو چیزیں مفید ہو سکتی تھیں، مثلاً گذشتہ قوموں کے سبق آموز حالات و واقعات، مذہبی تعلیم کی روح اور الٰہی پالیسی سے خود ان کے انحراف کے نتائج وغیرہ، ان کا بھی اجمالاً تذکرہ ہے،

بہرحال اس مرحلہ میں جو کچھ بھی بیان ہوا وہ ان کے نزدیک مسلّم تھا، اس کی اہمیت و افادیت اور اصل حقیقت سے انکار ان کے لیے نہایت مشکل تھا،

قومی و جماعتی زندگی میں یہی مرحلہ سب سے زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے، اسی کی درستگی اور استواری پر قوم کی فلاح و کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے اور اس میں معمولی کوتاہی کا خمیازہ آخر تک بھگتنا پڑتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ مکی دور کہلاتا ہے، اور قرآن حکیم کا تقریباً

۱۹/۳۰ حصہ اسی دور کے نوک پلک درست کرنے پر مشتمل ہے، اس حصہ میں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں اور خطاب عام طور پر "یا ایھا الناس" سے کیا گیا ہے،

(ب) قوم ایسے مرحلہ پر پہنچ گئی تھی کہ اس کی ذہنی فضا بڑی حد تک ہموار اور اخلاقی شعور بیدار ہو چکا تھا، حق و باطل میں امتیاز قائم ہو کر حق اپنی علٰحدہ تنظیم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، اس حالت کے لیے تفصیلی احکام کی ضرورت اور زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق بنیادی ہدایات درکار تھیں، چنانچہ قرآن حکیم کے اس حصہ میں عموماً زیادہ ایسے ہی مسائل ہیں اور خطاب بھی یا ایھا الذین آمنوا سے کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ مدنی دور کہلاتا ہے اور اس دور کی آیتیں زیادہ تر طویل اور تفصیلی ہدایات پر مشتمل ہیں،

اس طرح قرآن حکیم ۲۳ سال میں بتدریج نازل ہوا ہے، ۱۳ سال مکی دور کے ہیں اور ۱۰ سال مدنی دور کے ہیں،

دونوں دور کے احکام و نصوص میں چند باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے

تدوین فقہ کے مرحلہ میں دونوں دور کے احکام و نصوص میں درج ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے،

(۱) بنیادی اور عمومی حیثیت سے احکام میں انسانی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے کن کن باتوں کی رعایت کی گئی ہے،

(۲) آیتوں کے نزول کا پس منظر اور اس کے محرکات و اسباب کیا ہیں؟

(۳) قوانین کے اجرا میں معاشرتی اور سماجی حالت کی کتنی رعایت کی گئی ہے اور ان حالات کے پیش نظر قوانین کو کتنے مدارج سے گذارا گیا ہے،

(۴) ایک حکم کے بعد دوسرا اس کے متوازی حکم کس بنا پر آیا ہے؟

(۵) احکام میں وہ کون سی حکمت و علت مضمر ہے جس کی بنا پر وہ مادی اور روحانی فوائد کو تقویت پہنچاتے ہیں،

(۶) اصول و کلیات میں کیا روح کارفرما ہے، اور کس قسم کے مزاج کا وہ پتہ دیتے ہیں؟

(۷) جزوی قوانین کس روح کے مظہر ہیں؟ اور ان میں معاشرتی اور رواجی حالات کا کس قدر اثر ہے؟

(۸) کن احکام میں اس کی روح اور قالب دونوں مقصود ہیں، اور کن میں صرف روح مقصود ہے، قالب مقصود نہیں ہے؟

اوامر و نواہی میں قرآن حکیم کا پہلا اصول عدم حرج ہے

قرآن حکیم کی روح اور اصول و کلیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماخذ قانون نے تشکیل قانون کے مرحلہ میں انسانی طبیعت و مزاج کے پیش نظر ذیل کے اصول کی رعایت لازمی قرار دی ہے۔

(۱) عدم حرج (۲) قلت تکلیف (۳) تدریج (۴) اور نسخ

عدم حرج

حرج کے معنی "تنگی" ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے حرج کی تفسیر ضیق کے ساتھ مروی ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ قوانین ایسے ہوں جن میں آسانی اور سہولت ملحوظ رکھی گئی ہو نہ کہ تنگی اور ایسی دشواری کہ انسان کی برداشت سے باہر ہو۔ اس سلسلہ کی آیتیں پہلے گذر چکیں[2]، اور "و یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم" کا مفہوم ابھی اوپر گذرا ہے۔

قلت تکلیف

دوسرا اصول قلت تکلیف ہے

یہ عدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیونکہ قوانین میں جس قدر تنگیاں اور دشواریاں ہوں گی اسی قدر تکلیف میں زیادتی ہوگی، درج ذیل آیات میں اس اصول کی طرف اشارہ ہے۔

[1] ملاحظہ ہو تفسیر کشاف ص ۲۹۲ و تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۲۸ و حاشیہ تفسیر کبیر ص ۳۸۰۔ [2] ملاحظہ ہو "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" معارف بابت فروری ۵۸ء

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) — اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۵/۱۰۱) — اے ایمان والو (اپنی طرف سے کاوشیں کر کے) ان چیزوں کے متعلق سوالات نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں، اگر قرآن کے نزول کے وقت ان چیزوں کے متعلق سوال کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائینگی (لیکن اس کا نتیجہ خود تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا)

تدریج

تیسرا اصول تدریج ہے

قرآنی احکام ۲۳ سال کی مدت میں حالات و تقاضا کے لحاظ سے نازل ہوئے ہیں، ابتدا میں مجمل احکام عقائد و عبادات سے متعلق تھے، اور بعد میں مفصل احکام تمدنی معاملات وغیرہ سے متعلق، قومی اور جماعتی زندگی کی جتنی جیسی تربیت ہوتی گئی اور اسمیں تحمل اور انگیز کی جتنی صلاحیت بڑھتی گئی، اسی مناسبت سے غذا اور دوا کی تجویز ہوتی گئی ابتدا میں بچہ کو صرف دودھ پر رکھا گیا، یہ دودھ ایک طرف غذا کا کام دیتا رہا اور دوسری طرف زیادہ ثقیل غذا ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا رہا، درمیان میں وقتاً فوقتاً برداشت کے مطابق دوسری مقویات کا بھی استعمال کرایا جاتا رہا تا آنکہ بچہ اس قابل بنگیا کہ وہ غذا کو ہضم کر سکے، پھر غذا کے دینے میں بھی اس کی طبیعت اور مزاج کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی، یعنی نہ ایک ہی وقت میں ثقیل غذا دی گئی اور نہ انواع و اقسام کی غذاؤں کو ایک ہی وقت میں دینے کی کوشش کی گئی، یعنی مجموعی حیثیت سے اوامر و نواہی میں بتدریج ترقی کے مدارج طے کرائے گئے

حتیٰ کہ نماز روزہ وغیرہ اوامر اور شراب جوے وغیرہ نواہی میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اور قوت ہضم کے عملی معائنہ کے بعد جن مختلف مراحل سے گذارا گیا، عہد نبوت کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ان سے واقف ہے،

یہ طریقۂ کار اور یہ تدریجی ارتقاء، قانون کی دنیا میں یہ ذہنیت پیدا کرانا چاہتا ہے کہ دنیا کا کوئی قانون اور کوئی نظام اوپر سے نہیں مسلّط کیا جا سکتا ہے، بلکہ اندر سے ابھرتا ہے، اور ہر بنِ مو سے رس رس کر نکلتا ہے، اور وہی قانون کامیاب ہوتا ہے جو انسان کی فطرت اور تربیت یافتہ رجحانات سے موافقت کرتا ہے، تکمیلی شریعت کا یہ پہلو بھی اصل حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ لم یدع شیئا من الکرامۃ والبر الا اعطا ھذہ الامۃ ومن کرامتہ واحسانہ انہ لم یوجب علیھم الشرائع دفعۃ واحدۃ ولکن اوجب علیھم مرۃ بعد مرۃ[1]

فضیلت و کرامت کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا نہ فرمایا ہو، یہ بھی اسی کا فضل و احسان ہے کہ شرائع (احکام) کو اس نے ایک ہی دفعہ میں نہیں اتارا، بلکہ یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ واجب کیا،

اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ قانون کے اجرا میں تدریجی طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے اور زیادہ زور تعلیم و تربیت (ذہنی فضا ہموار کرنے) پر دینا چاہیے، نیز ابتدائی مرحلہ میں قوانین کم ہونے چاہییں کہ آسانی کے ساتھ ان کا علم حاصل کیا جا سکے اور عمل میں

۱؎ قرطبی ج ۳ ص ۵۲

زیادہ دشواری نہ ہو، پھر جیسی جیسی فضا ہموار ہوتی جائے، زندگی کے مختلف گوشوں میں شرعی قوانین کا نفاذ ہوتا رہے،

نسخ

چوتھا اصول نسخ ہے

نسخ کے دو مطلب ہیں (۱) ایک تو یہ کہ پہلا حکم بالکلیہ ختم کر دیا جائے اور (۲) دوسرے یہ کہ حالات و تقاضا کے لحاظ سے پہلے حکم میں کسی قسم کی ترمیم کر دی جائے، یعنی اگر وہ عام ہے تو اسے خاص بنا دیا جائے، مطلق ہے تو مقید کر دیا جائے، غرض اس طرح اس کا استعمال محدود بنا دیا جائے، پہلے کا تعلق ماقبل کی شریعت سے ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے،

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۱)

(ہمارا مقررہ قانون ہی) کہ ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کرتے ہیں۔

محققین مفسرین کی رائے ہے کہ اس آیت میں ماقبل کی شریعت کی منسوخیت کا ذکر ہے، جیسا کہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں،

انما ذکر فیھا من النسخ فانما المراد بہ نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین[1]

آیت میں نسخ کا تذکرہ ہے اس سے مراد سابق انبیاء کی شریعتوں کا نسخ ہے،

ابو مسلم اصفہانی متوفی ۳۲۲ھ کی یہی رائے ہے، چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ نے

۱؎ احکام القرآن

اپنی تفسیر میں قرآن حکیم کی تمام ان آیتوں کے ذیل میں جن کو بعضوں نے منسوخ مانا ہے، ابو مسلم کا قول عدم نسخ کے بارے میں نقل کیا ہے اور ان کی بیان کردہ توجیہ کو ذکر کیا ہے جس سے امام رازی کا رجحان بھی عدم نسخ کی طرف معلوم ہوتا ہے،

قرآن حکیم میں نسخ کی حیثیت

اور دوسرے کا تعلق شریعت محمدیہ سے ہے، لیکن اس نسخ کی حیثیت تبیین و تفسیر کی ہے، نہ کہ حقیقی نسخ کی، اسی بنا پر فقہا نے اس کا تذکرہ "بیان" کے ضمن میں کیا ہے۔[1]

قرآنی احکام میں نسخ کے سلسلہ میں سلف سے جو معنی منقول ہیں وہ یہ ہیں،

هو رفع الظاهر لتخصيص	کسی تخصیص، تقیید، شرط یا مانع کی وجہ سے
او تقييد او شرط او مانع	ظاہری حمل کو نظر انداز کر دینا عموماً طور
فهذا اكثر من السلف يسميه نسخاً[2]	پر سلف اسی کا نام نسخ رکھتے ہیں۔

جب قرآنی احکام معاشرتی حالات کی بنا پر ۲۳ سال کی مدت میں بتدریج نازل ہوئے ہیں تو موقع اور محل کو بہانہ بنا کر کسی حکم کے بالکلیہ ختم کر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، حالات و تقاضا کی مناسبت سے روح اور مقصد کو باقی رکھتے ہوئے توسیع و تخفیف، تعمیم و تخصیص کی صورت ہی مراد ہو سکتی ہے، اگر ہم اس صورت کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اسلامی فقہ کی لچک اور وہ عملی استعداد ختم ہو جاتی ہے، جس نے اس کو ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے فیصلہ کن حیثیت دی ہے،

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے،

والثاني ان يكون شئ مظنة	نسخ کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی مصلحت کی
مصلحة او مفسدة فيحكم عليه	رعایت سے یا مفسدہ کے اندیشہ سے کوئی

[1] توضیح تلویح ص ۳۳ وغیرہ [2] اعلام الموقعین

حسب ذلك ثم ياتي زمان	حکم دیا جائے، پھر ایسا زمانہ آجائے کہ
لا يكون فيه مظنة لها فيتغير	اس میں یہ مقصود نہ رہ جائے تو وہ
الحكم[1]	حکم بدل جائے گا۔

حقیقی نسخ اس کو اس بنا پر نہیں کہتے ہیں کہ مثلاً ایک دور میں معاشرتی حالات کی بنا پر کسی حکم کی عمومیت میں خصوصیت پیدا کر لی گئی، پھر کچھ دنوں بعد قومی زندگی میں سابقہ حالات پھر ابھر آئے تو لازمی طور سے وہ عمومیت پھر واپس آجائے گی، حقیقی نسخ اگر ہوتا جیسا کہ ماقبل کی شریعتوں میں ہوا ہے تو دوبارہ واپسی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا، غور سے دیکھا جائے تو یہ طریقہ کار سماجی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے، اور قانون کو معاشرتی حالات کے مطابق ڈھالنے میں اس سے بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اس کی مثال ماہر طبیب کے اس نسخہ کی سمجھنا چاہیے جس میں وہ نبض کی حرکت، مریض کی حرارت، مرض اور مزاج کی کیفیت و نوعیت کی بنا پر جزوی تبدیلی کرتا رہتا ہے، اور اگر کبھی سابقہ حالت پھر واپس آجاتی ہے یا کسی اہم مضرت کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے تو سابقہ لکھی ہوئی دوا میں پھر استعمال کرنے لگتا ہے، بعینہ اس کا بھی رویہ تجویز کی ہوئی غذا کے بارے میں ہوتا ہے۔

نسخ سے مستنبط اصول کی تشریح

قرآن حکیم کے مذکورہ طریق کار سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ قوت نافذہ ارباب علم و نظر کے مشورہ سے وقتی معاشرتی مصالح کے پیش نظر بعض شرعی احکام میں ترمیم کر سکتی ہے، چنانچہ سلف کے زمانہ میں اس پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا ہے،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے "تفردات" اس بارے میں کافی شہرت رکھتے ہیں، وہ

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۲

در اصل اس نوع کے "تفردات" نہیں ہیں کہ کسی شخص کی ذاتی رائے وقیاس پر مبنی ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، بلکہ اسی اصول کے ماتحت روح اور مقصد کو باقی رکھتے ہوئے قرآنی احکام کو بدلے ہوئے حالات پر منطبق کرنے کی ایک بہترین شکل تھی جو بعد والوں کے لیے دلیل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

فقہاء نے قرآن حکیم کے اسی طریق کار سے استحسان، استصلاح تعدیل، تبدل احکام بہ تبدل زمان وغیرہ اصول اخذ کیے ہیں اور انھیں "ماخذ قانون" کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ فقہ کے ذخیرہ میں رد المحتار وغیرہ میں بہت سی صورتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں وقتی مصالح کی بنا پر "قوت نافذہ" کے اختیارات اتنے وسیع مانے گئے ہیں کہ بعض جائز معاملات کو بھی وقتی طور پر وہ ممنوع قرار دے سکتی ہے، اور حکم کے نفاذ کو مؤخر کر سکتی ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فقہا نے تعمیم وتخصیص وغیرہ کے جو قواعد مقرر کیے ہیں انھیں بالکلیہ نظر انداز کرنے کی صورت میں بے لگام عقل وہوس کے مفاسد سے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

شان نزول سے خاص واقعہ نہیں بلکہ حالات کیفیت مراد ہوتی ہے

قرآنی تصریحات میں موقع ومحل کی تعیین اور حالات وتقاضا کی مناسبت عمومی حیثیت سے کلی ومدنی تقسیم سے معلوم کی جاتی ہے اور خصوصی حیثیت سے شان نزول سے معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شان نزول کے ضمن میں جو واقعات نقل کیے جاتے ہیں ان سے کوئی خاص واقعہ مراد نہیں ہوتا ہے بلکہ لوگوں کی وہ حالت وکیفیت مقصود ہوتی ہے جو اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے یعنی معاشرہ کو جو احوال ومسائل درپیش ہوتے ہیں، یہ واقعات انکی نمایندگی اور نشاندھی کرکے حالات کو سمجھنے کے لیے مواد کی فراہمی کرتے ہیں۔

یہ نمایندگی اور نشاندہی اسی حد تک معتبر ہے جس حد تک کہ ان کی تائید قرآن حکیم کی ان تصریحات سے ہوتی ہو جن کے بارے میں یہ واقعات منقول ہیں لیکن اگر کہیں ایسا ہو کہ الفاظ ومعانی سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے یہ واقعات اس کے خلاف کی نشاندہی کریں یا ان کے معتبر مان لینے میں کسی اصول کلیہ پر زد پڑنے کا اندیشہ ہو تو پھر ان واقعات کی کوئی حیثیت نہ ہوگی، بلکہ قرآنی آیات ہی مستقل بالذات ہوں گی، اسی بنا پر محققین مفسرین کی رائے ہے کہ اصل شان نزول وہ ہے جو آیات کے سیاق وسباق اور الفاظ ومعانی سے ابھرے اور موقع ومحل کی تعیین اور حالات کی مناسبت وہی معتبر ہے جو قرآنی تصریحات سے مترشح ہو، جیسا کہ اس کی تائید علامہ سیوطی کے درج ذیل اشارات سے ہوتی ہے۔

"زرکشی" نے "برہان" میں لکھا ہے کہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کی عام عادت تھی کہ وہ کہتے ہیں فلاں آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے گویا آیت حکم پر ایک قسم کا استدلال ہے نہ کہ اس واقعہ کا نقل مقصود ہوتا ہے اور نہ یہ واقعہ بعینہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوتا ہے ...... میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آیت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا ہے"۔[1]

آیات قرآنی کو شان نزول دریافت کرنے کی ایک مثال سے وضاحت

آیات قرآنی سے اسباب نزول دریافت کرنے کی مثال ماہر طبیب جیسی ہے کہ وہ نسخہ دیکھکر اس مرض کا پتہ لگا لیتا ہے جس کے لیے وہ نسخہ لکھا گیا ہے اور دوائیوں کے خواص واثرات میں غور کرکے مریض کے مزاج اور کیفیات کا مطالعہ کر لیتا ہے، اور مریض کے زبانی بیان سے مزید تائید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعہ طبیب اپنی رائے کو تقویت پہنچاتا ہے۔

[1] از تفسیر نظام القرآن ص ۲۴

اس انداز سے مطالعہ کرنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اصول وکلیات ابھر کر سامنے آئیں گے جو قرآن حکیم کے مطلوب ومقصود ہیں اور پھر ان کے ذریعہ استدلال واستنباط میں سہولت ہوگی، نیز موقع ومحل منطبق کرنے کی راہیں ہموار ہوں گی اور شان نزول سے تشریحی وتائیدی قاعدہ کے علاوہ نہایت اہم فائدہ یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ حکم کی حکمت وعلت کی طرف رہنمائی ہوگی جس سے فکر ونظر میں وسعت اور حکم کو حالات وتقاضا کے مطابق عملی شکل دینے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

حکمت وعلت کے دریافت کے لیے پورے نظام پر فکری وعملی نظر درکار ہے

قرآنی مباحث میں حکمت وعلت کی بحث نہایت نفیس اور عمیق ہے، اسی کی وجہ سے ماضی وحال کا رشتہ ٹوٹنے نہیں پایا ہے، اساطین امت نے اس سلسلہ میں بڑا کام کیا ہے اور قرآنی تعلیمات کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ثابت کرکے اس کی دوامی اور ہمہ گیر پوزیشن کو واضح کیا ہے[1]، یہاں بنیادی حیثیت سے صرف یہ بتانا ہے کہ جب تک قرآن حکیم کے فکری وعملی نظام میں گہری نظر نہ ہو اور انسان کی عملی زندگی میں جڑ نہ پکڑے اس وقت تک حکمت وعلت کے دریافت میں صحیح زاویۂ نگاہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے، اس بارے میں حسب ذیل چیزیں بالخصوص زیادہ اہم ہیں: دین اور دنیا کا تعلق، موت وحیات کا رشتہ، دنیا وآخرت میں جزا وسزا کا قانون، تہذیب نفس کے اصول، حقیقی فلاح وبہبود کی راہیں، انسانی فطرت، انفرادی واجتماعی زندگی کی حدیں، زندگی کے حالات سے متعلق احکام، سلسلۂ ہدایت اور اس کا بتدریج ارتقاء، ملی مصلحت وسیاست اور استنباط قوانین کے طریقے وغیرہ، قرآن حکیم کے جزوی احکام کے ذیل میں عرب کے معاشرتی حالات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ بالخصوص زیادہ اہم ہے۔

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کے معاشرہ کا کہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے، نیز یہ کہ کن احکام کے نفاذ کو سردست موخر کیا جا سکتا ہے؟ اور کن کی روح کو باقی رکھتے ہوئے بدلے ہوئے حالات کے مطابق نیا جامہ تیار ہو سکتا ہے؟

قرآن حکیم میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں ساتھ ہی ساتھ علت بھی بتا دی گئی ہے، اس سے استدلال واستنباط کے جو طریقے فقہائے مقرر کیے ہیں، ان سے واقفیت بھی ضروری ہے، ورنہ حدود وقیود کی رعایت کیے بغیر غلط استدلال کا نتیجہ کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم نے اوامر ونواہی کے سلسلہ میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اور مامورات ومنہیات کے رعایت حال درجے اور مراتب قائم کیے ہیں، فقہائے اصولی رنگ دے کر انھیں کافی وسیع بنا دیا ہے،

ان سب سے بحیثیت ماخذ استفادہ کے لیے نہایت باریک بینی وہمہ جہتی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

(باقی)

دولتِ ماہانیہ سنجان (بمبئی)

(۱۹۸ھ تا ۲۲۷ھ)

ازجناب قاضی اطہر مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

بمبئی سے متصل شمال جانب ضلع تھانہ واقع ہے، یہ مقام اور اس کے ملحق کئی بستیاں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور ان کی عظمت ہمیشہ سے مسلّم رہی ہے،

(۱) چیمور جواب بمبئی عظمیٰ کا ایک علاقہ ہے، اور کرلا کے سامنے مشرق کی جانب لوکل ٹرین کا دوسرا اسٹیشن ہے، وہ اب سے ہزاروں سال پہلے بلاد چیمور کا مرکز رہ چکا ہے، اور عرب مسلمانوں اور مسلم تاجروں کا بڑا اہم مقام تھا، یہاں پر مسلم نو آبادی کے لیے راجہ بلہرا کی طرف سے مسلمان حاکم (قاضی) مقرر ہوا کرتا تھا، جو ان کے تمام قضیوں کا فیصلہ کرتا تھا، اور یہ سرکاری عدالت کا فیصلہ مانا جاتا تھا،

(۲) سوپارہ جسے آج کل نالا سپارا کہتے ہیں، ضلع تھانہ کا دوسرا اہم مقام ہے جو ویسٹرن ریلوے پر شمال کی جانب سورت کے راستہ میں بسئی اور ویرار کے درمیان واقع ہے، اس بستی کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے، اور حکومت کی طرف سے محکمۂ آثار قدیمہ نے یہاں کئی تاریخی چیزیں برآمد کی ہیں، قدیم سوپارہ موجودہ سوپارہ کے چند فرلانگ کے فاصلہ پر کھنڈر اور گھنے باغات کی صورت میں موجود ہے،

(۳) اس کے آگے پال گڑھ اور واپی کے درمیان "سنجان" ہے، یہ بستی بھی ضلع تھانہ

ہی میں ہے، جسے قدیم عرب جغرافیہ نویس، سیاح اور تاجر "سندان" کے نام سے یاد کرتے ہیں، آجکل چھوٹی سا قصبہ ہے، جہاں ایک معمولی بازار ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ کچھ مسلمان بھی یہاں بستے ہیں، ایرانی النسل مجوسی بھی یہاں آباد ہیں، اور ان کا بہت بڑا تاریخی نشان ماضی قریب ہی بنایا گیا ہے، جو عہد فاروقی میں ان کے ایران سے یہاں آنے اور مرکز بنانے کو ظاہر کرتا ہے،

قدیم زمانہ میں یہاں کی بندرگاہ سے عرب ممالک کو چاول، شہد، ساگوان، بید، کپڑا، بانس، جوتے، آم، کیلے وغیرہ بڑی مقدار میں جایا کرتے تھے، آج بھی یہ علاقہ چاول، دھان اور شہد کے لیے مشہور ہے، اور یہ چیزیں خاص طور سے زیادہ مقدار میں پیدا ہوتی ہیں، اور باہر جاتی ہیں،

اسی سنجان (سندان) ضلع تھانہ میں (۱۹۸ھ سے ۲۲۷ھ تک) ایک عرب مسلمان "فضل بن ماہان مولیٰ بنی سامہ" نے خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی تھی، اور اس قلیل مدت میں اس کے تین حکمران فضل بن ماہان بانی ریاست اور اس کے بیٹے محمد بن فضل اور ماہان بن فضل بالترتیب حکمراں ہوئے ہیں، اس ریاست کو ہم "دولتِ ماہانیہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی خشتِ اول قرار دیا جا سکتا ہے،

تعجب ہے کہ دولت ماہانیہ سندان کا تذکرہ صرف مشہور مورخ بلاذری نے فتوح البلدان کے باب فتوح السند کے آخر میں بہت مختصر طور پر کیا ہے، اور کسی عربی یا ہندی مورخ نے اس کا کوئی ذکر صریح طور پر نہیں کیا، مگر دوسرے تاریخی شواہد سے اس ریاست کا پتہ چلتا ہے،

اس مقالہ میں "دولت ماہانیہ سندان" پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، جو غالباً عربی اور اردو میں پہلی کوشش ہے، اگر کوئی صاحب اس موضوع پر مزید معلومات فراہم

فرمائیں گے تو ہندوستان میں مسلم تاریخ کی خدمت ہوگی اور راقم الحروف شکر گذار ہوگا۔

سندان کا محل وقوع | سندان جسے آجکل سنجان کہتے ہیں، بمبئی سے شمال جانب چند میل پر ایک قدیم آبادی ضلع تھانہ میں ہے، اور اس کے آس پاس تانہ (تھانہ) صیمور (چیمور)، سوبارہ (سوپارہ) وغیرہ واقع ہیں، جس زمانہ سے ہم بحث کر رہے ہیں، اس زمانہ میں ان تمام مقامات پر گجرات کے راجگان جو وبھی رائے کے خاندان سے تھے، حکومت کرتے تھے، اور ان کے گماشتے اور عمال ان مقامات میں رہا کرتے تھے، یہ حکمراں خاندان عربوں سے بڑی محبت کرتا تھا، اور ان کے بارے میں رعایا اور حکمراں دونوں بڑی خوش عقیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

چنانچہ سلیمان تاجر (موجود ۲۳۷ھ) جو ہندوستان اور چین کا سب سے قدیم عرب سیاح ہے، اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے،

فاما بلھرا ھذا فانہ اشرف الھند، وھم لہ مقرون بالشرف وملوکھم یعمرون ربما ملک احدھم خمسین سنۃ وتزعم اھل مملکۃ بلھرا انما یطول مدۃ ملوکھم واعمارھم فی الملک لمحبتھم العرب ولیس فی الملوک اشد حبا للعرب منہ، وکذلک اھل مملکتہ وبلھرا اسم لکل ملک منھم ککسریٰ ونحوہ ولیس باسم لازم، وملک بلھرا ارضہ ساحل البحر وھی بلاد تدعی الکمکم متصلۃ علی الارض الی الصین[1]

یہ بلہرا (وبھی رائے) ہندوستان کے راجوں میں سب سے شریف ہے، اور تمام راجے مہاراجے اس کی شرافت وعظمت کے معترف ہیں، اس خاندان کے راجوں کی عمریں زیادہ ہوتی ہیں، بسا اوقات ایک راجا پچاس سال تک حکومت کرتا ہے، اس حکومت کے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے راجوں کی عمریں اور انکی حکومتیں اسلیے طویل ہوتی ہیں کہ وہ عربوں سے محبت کرتے ہیں، ہندوستان کے راجوں میں بلہرا سے زیادہ کوئی راجہ عربوں سے محبت نہیں رکھتا، اسی طرح اس کی رعایا بھی عربوں سے شدید محبت رکھتی ہے، بلہرا ہر راجہ کا لقب ہوتا ہے کسریٰ وغیرہ کی طرح، یہ کسی خاص راجہ کا نام نہیں، راجہ بلہرا کی مملکت میں ساحلی علاقہ بھی ہے جسے کم کم (کوکن) کہتے ہیں، یہ علاقہ چین تک پھیلا ہوا ہے۔

ابن رستہ (زمانہ ۲۹۰ھ) نے الاعلاق النفیسہ میں لکھا ہے:

وبعدہ ملک من ملوک الھند یقال لہ بلھرا ومعنی بلھرا انہ ملک ملوک الھند وھو فی بلادہ یقال لہ الکمکم اسم ھندی وبلادہ بلاد الساج ومنھا یجلب[2]

دکھن کے بعد ہندوستان کے راجوں میں بلہرا نامی راجہ ہے، بلہرا کے معنی مہاراجہ کے ہیں، یہ راجہ اپنے علاقہ میں رہتا ہے جسے کم کم (کوکن) کہتے ہیں، یہ ہندی لفظ ہے، اس راجہ کی مملکت میں ساگوان ہوتا ہے اور یہاں سے دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے،

ابن رستہ کے بعد عرب جغرافیہ نویس ابن خرذادبہ (متوفی حدود ۳۰۰ھ) نے اپنی کتاب المسالک والممالک میں لکھا ہے،

واعظم ملوک الھند بلھرا وتفسیرہ ملک الملوک

ہندوستان کے راجوں میں سب سے بڑا راجہ بلہرا ہے، جسکے معنی مہاراجہ کے ہیں، اسکی انگوٹھی

---

[1] سلیمان تاجر طبع لیڈن [2] الاعلاق النفیسہ طبع لیڈن

عربی	اردو
ونقش خاتمه من ودّ ك	کے نگینہ پر یہ عبارت کھدی ہے، "جو آدمی کسی غرض
لرهم ولّی مع انقطاعه وينز ل	سے تم سے دوستی کریگا وہ غرض پوری ہونے کے
الكمكم بلاد الساج[1]	بعد اپنی راہ لیگا" یہ راجہ ساگون کے علاقہ کمکم
	(کوکن) میں بھی مقام کرتا ہے۔

اس کے بعد مشہور مورخ وسیاح مسعودی جو ۳۰۳ھ میں بلہرا کی سلطنت میں آیا تھا اور کنبائت، چیمور، تانہ، سوپارہ، سندان، بھڑوچ اور دوسرے مقامات میں رہ چکا ہے، مروج الذہب میں لکھتا ہے،

عربی	اردو
واعظم ملوك الهند فی	ہمارے زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا
وقتنا هذا البلهرا صاحب مدينة	راجہ بلہرا (ولبھی رائے) مانکیر (منگرور)
مانكير.... فاما البلهرا فا	والا ہے۔ اس کی مملکت اور سمندر کے
بين ديار ملكه وبين البحر	درمیان اسی فرسنگ سندھی کی
مسيرة ثمانين فرسخا سندية	مسافت ہے۔ ایک فرسنگ آٹھ
والفرسخ ثمانية اميال.... ليس	میل کا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے راجوں
فی ملوك السند والهند	میں بلہرا کے علاوہ کوئی راجہ اپنے ملک میں
من يعز المسلمين فی ملكه	مسلمانوں کو معظم (قوم) نہیں سمجھتا، بلہرا
الا البلهرا فالاسلام فی	کے ملک میں اسلام کا احترام اور اسکی
ملكه عزيز مصون، ولهم	حفاظت ہے۔ یہاں مسلمانوں کی مسجدیں
مساجد مبنية وجوامع	جامع مسجدیں نمازیوں سے معمور رہتی ہیں
معمورة بالصلوات للمسلمين	اس خاندان میں ایک ایک راجہ چالیس چالیس

[1] المسالک والممالک ص ۶۷ طبع لیڈن۔

عربی	اردو
ويملك الملك منهم الاربعين	اور پچاس پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ
سنة، والخمسين سنة فصاعداً	سال تک حکومت کرتا ہے۔ اہل ملک کا
واهل مملكته يزعمون انه	عام خیال ہے کہ ان کے راجوں کی عمریں
انما طالت اعمار ملوكهم	اس لیے لمبی ہوتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے
لسنة العدل واكرام المسلمين	ساتھ انصاف اور احترام کا معاملہ کرتے
وهو ملك يرزق الجنود من بيت	ہیں، یہ راجہ مسلمانوں کی طرح اپنے سرکاری
ماله كفعل المسلمين بجنودهم	خزانہ سے فوجیوں کی تنخواہیں ادا کرتا ہے،
..... وتدعی بلاده ايضا	اس کے علاقہ جات کو بلاد کمکر (کوکن)
بلاد الكمكر[1]	بھی کہتے ہیں،

مسعودی کے ۳۷ سال بعد اصطخری (۳۴۰ھ) نے اپنی کتاب مسالک الممالک میں لکھا ہے:

عربی	اردو
ومن كنباية الی صيمور من	کھمبائت سے چیمور تک ہندوستان کے ایک
بلد بلهرا بعض ملوك الهند	راجہ بلہرا کی مملکت میں ہے، یہ علاقہ کفرستان
وهی بلاد كفر الا ان هذه	ہے مگر اس کی بستیوں میں مسلمان رہتے
المدن فيها المسلمون ولا يلی	ہیں، اور مسلمانوں پر بلہرا کی طرف سے صرف
عليهم من قبل بلهرا الا مسلم	مسلمان حاکم ہوتا ہے۔ ان بستیوں میں
وبها مساجد يجمع فيها الجمعات	مسجدیں ہیں جن میں جمعہ وجماعت کا قیام
ومدينة بلهرا التی يقيم	ہوتا ہے، راجہ بلہرا کا شہر جس میں وہ مستقل

[1] مروج الذہب طبع مصر

فيها مانكير وله مملكة عريضة[1]	رہتا ہے، مانگیر (منگرور) ہے، اسکی مملکت بہت لمبی چوڑی ہے۔

اصطخری نے بلاد سندھ اور بلاد ہند کو الگ الگ بیان کیا ہے، اور دونوں ملکوں کے شہر اور مشہور مقامات کی تفصیل تحریر کی ہے، اور سندان کو "مدن الهند" میں شمار کیا ہے، چنانچہ "مدن السند" کی تفصیل کے بعد لکھتا ہے،

واما مدن الهند فهي قامهل	اس کے بعد ہندوستان کی یہ بستیاں ہیں،
وكنباية وسوبارة وسندان	قامہل، کنبائت، سوپارہ، سندان، چیمور،
وصيمور والملتان وجندراور	ملتان، جندراور بسمد ہندوستان کے
وبسمد فهذه من مدن الهند	شہروں میں، ان مقامات کا علم ہمیں
البلاد التي عرفناها[2]	ہو سکا ہے۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندان ہندوستان کا ایک اہم مقام تھا، جو شاہان گجرات کی عملداری میں تھا، ولبھی رائے خاندان کا دار السلطنت مانکیر (بھاؤنگر) تھا، مگر وہ بلاد کم کم (دوکن) تک حکمرانی کرتے تھے اور کھنبائت سے چیمور تک کا علاقہ شمول تھا، سوپارہ، سندان وغیرہ ان ہی کے زیر نگیں تھا، اور یہاں کے راجہ اور ہندو عوام عربوں اور مسلمانوں سے بہت مانوس تھے، ان کے وجود کو اپنے لیے باعث برکت سمجھتے تھے، حکومت اور سیاست میں مسلمانوں کی تقلید اور رعایت کرتے تھے، اور ان کا عسکری نظام مسلمانوں سے ملتا جلتا تھا، اور ان کی حکومت میں مسلمانوں کے مسلمان حکمران سرکاری طور پر رکھے جاتے تھے، اور مسلمانوں کو اپنے دینی معاملات میں ہر طرح آزادی تھی، وہ اپنے

[1] مسالک الممالک ص ۳، طبع لیڈن [2] ایضاً ص ۷۲

جملہ معاملات میں اسلامی قوانین پر آزادی سے عمل کرتے تھے۔

سندان کے محل وقوع کی مزید تحقیق و تخصیص کے لیے ہمیں ان ہی عرب جغرافیہ نویسوں، سیاحوں اور مورخوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جنھوں نے اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے، خرذادبہ نے سندان کو بلاد السند میں اور کنبائت، بھیلمان، بھروچ، دیبج، بالی وغیرہ کو سندھ کے شہروں میں شمار کیا ہے[1]، حالانکہ بعد کے جغرافیہ نویس ان مقامات کو بلاد ہند میں شمار کرتے ہیں[2]، اور قامہل سے لیکر چیمور، سوپارہ اور سندان وغیرہ کو اس میں بتاتے ہیں، اور خود ابن خرذادبہ نے المسالک والممالک ہی میں اس سے پہلے ان مقامات کو بلاد ہند میں شمار کیا ہے، چنانچہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کی مسافت کے بیان میں لکھتا ہے،

ومن مهران الى اوتكين	مہران (دریائے سندھ) سے اوتکین
وهي اول ارض الهند	تک مہران سے ہندوستان شروع
مسيرة اربعة ايام	ہوتا ہے، چار دن کی مسافت ہے۔

پھر ارض الہند کے شہروں کی مسافت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ومن كولى الى سندان ثمانية	کولی سے سندان تک ۱۸ فرسنگ ہے،
عشر فرسخا وبها ساج وقنا	یہاں ساگوان اور بانس پائے جاتے
ومن سندان الى ملي مسيرة	ہیں، اور سندان سے ملی (ملیبار)
خمسة ايام[3]	تک پانچ دن کی مسافت ہے۔

مسعودی نے بحر فارس کے بعد بحر لاروی (علاقہ کاٹھیاوار و گجرات) کا ذکر کرتے ہوئے

[1] المسالک والممالک ص ۵۷ [2] قدیم جغرافیہ نویس سندھ اور ہند کو دو علحدہ علحدہ ملک لکھتے ہیں۔ [3] المسالک والممالک ص ۶۲

لکھا ہے

وعليه بلاد صيمور، وسوبارة وتانه وسندان وكنباية ثم بحر هركند[1]

اس کے ساحل پر چیمور کا علاقہ سوبارہ، تھانہ، سندان اور کنبائت واقع ہیں، اس کے بعد بحر ہرکند شروع ہوتا ہے۔

مسعودی نے کنبایت کے جوتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

وفيها تعمل وفيما يليها مثل مدينة سندان وسوبارة[2]

یہ جوتے کنبائت اور اس سے متصل شہروں مثلاً سندان اور سوپارہ میں تیار کیے جاتے ہیں،

اصطخری نے بلاد ہند کی مسافت کے ذکر میں لکھا ہے۔

من كنباية الى سوبارة نحو ۴ مراحل وسوبارة من البحر على نصف فرسخ وبين سوبارة وسندان نحو ۵ مراحل وهي ايضاً على نصف فرسخ من البحر وبين صيمور وبين سندان نحو ۵ مراحل[3]

کنبایت سے سوپارہ تک تقریباً ۴ مرحلہ سوپارہ سمندر سے نصف فرسخ پر واقع ہے، اور سوپارہ اور سندان کے درمیان ۵ مرحلہ کی مسافت ہے، سندان بھی سمندر سے نصف فرسخ پر واقع ہے، اور چیمور اور سندان کے درمیان ۵ مرحلہ کی مسافت ہے۔

مقدسی بشاری جو ہندوستان کے ساحلی مقامات میں آچکا ہے، اور جس نے اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ۳۷۵ھ میں مرتب کی ہے، اس نے سندان

[1] مروج الذہب [2] ایضاً [3] مسالک الممالک، ۱۲۹۔

کا شمار صوبہ ویہند میں کیا ہے اور اسے مدن الہند میں مانا ہے۔

مدن الهند قامهل كنباية سوبارة سندان صيمور، الملتان جندرور بسمد[1]

ہندوستان کے شہروں میں قامہل، کنبائت سوپارہ، سندان، چیمور، ملتان، جندراور، بسمد ہیں،

آگے چلکر شہروں کی مسافت بیان کرتے ہوئے مقدسی نے لکھا ہے،

ومن المنصورة الى قامهل ۸ مراحل، ثم الى كنبايت ۴ مراحل ثم الى سوبارة مثلها وهي على فرسخ من البحر، ومن سندان الى صيمور، ۵ مراحل[2]

منصورہ (سندھ) سے قامہل (ہندستانی سرحد) تک ۸ مرحلہ، پھر کنبائت تک ۴ مرحلہ، پھر سوپارہ تک ۴ مرحلہ، یہ سمندر سے ایک فرسخ کی دوری پر واقع ہے، اور سندان سے چیمور تک ۵ مرحلہ کی مسافت ہے،

قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں سندان کا ذکر یوں کیا ہے۔

وهي مدينة على ثلاثة ايام من تانه موقعها في الاقليم الاول، قال في القانون حيث الطول مائة واربع درج، وعشرون دقيقة والعرض تسع عشرة درجة وعشرون دقيقة[3]

سندان ایک شہر ہے جو تھانہ سے تین دن کی مسافت پر ہے، اس کا محل وقوع اقلیم اول ہے، طول البلد ۱۰۴ درجہ اور بیس دقیقہ ہے، اور عرض البلد ۱۹ درجہ اور بیس دقیقہ ہے۔

[1] احسن التقاسیم ص ۴۷۷ [2] ایضاً ص ۴۸۶ [3] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۷۲

ابو الفداء نے تقویم البلدان میں سوپارہ کے بیان میں لکھا ہے،

وبینہا وبین مدینۃ سندان	سوپارہ اور سندان کے درمیان ۵ مرحلہ
خمس مراحل	کی مسافت ہے،

اور خود سندان کے بیان میں لکھا ہے،

سندان من سواحل الھند	سندان ہندوستان کے ساحل پر تھانہ
من بلاد تانہ وقال بعض المسافرین	کے شہروں میں ایک شہر ہے، بعض مسافروں
ان ھنالک سندان ابور السندان	کا کہنا ہے کہ یہاں پر جو شہر ہے اس کا نام
قال بعض المسافرین وسندابور	سندان نہیں سنداپور ہے، اور یہ سنداپور
عن تانہ علی نحو ثلاثۃ ایام	تھانہ سے تین دن کی دوری پر واقع ہے،
وھی علی جون من البحر الاخضر	اور بحر اخضر کی ایک کھاڑی پر آباد ہے،
قال وسندابور آخر الجزرات	سنداپور (سندان اتر کی طرف) گجرات کی
واول الملیبار، قال فی القانون	آخری سرحد ہے، اور یہیں سے مالابار شروع
وھی علی الساحل قال فی العزیزی	ہوتا ہے، یہ ساحلی شہر ہے، اور اس کے
ومدینۃ سندان بینہا وبین	اور منصورہ کے درمیان ۱۵ فرسخ
المنصورہ خمسۃ عشر فرسخا[1]	کی مسافت ہے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ سندان کا شہر چیمور، سوپارہ اور تھانہ کے پاس ہی ساحل پر واقع ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ | اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا تعلق سندھ سے نہیں، بلکہ ہندوستان

[1] تقویم البلدان طبع یورپ

ہے، اور نالہ سوپارہ، چیمور، تھانہ اور بسئی کی طرح سندان (سنجان) بھی قدیم تاریخی مقام رہ چکا ہے جہاں اس ملک میں سب سے پہلے مسلم ریاست وجود میں آئی مگر برادرانہ خانہ جنگی کی نذر ہوگئی، مگر یہاں ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے، مشہور جغرافیہ نویس یاقوت حموی بغدادی نے معجم البلدان میں سندان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

انما سندان مدینۃ فی	سندان سندھ کے پاس ایک شہر ہے، اس کے
ملاصقۃ السند، بینہا وبین	اور دیبل ومنصورہ کے درمیان ۱۰ مرحلہ کا
الدیبل والمنصورۃ عشر	فاصلہ ہے، اور سندان اور سمندر کے
مراحل .... وبینہا وبین البحر	درمیان نصف فرسخ کی مسافت ہے
نحو نصف فرسخ وبینہا وبین	اور اس کے اور چیمور کے مابین تقریباً
صیمور نحو خمس عشرۃ مرحلۃ[2]	۱۵ مرحلہ کی مسافت ہے،

یاقوت حموی نے چیمور اور سندان کی درمیانی مسافت ۱۵ مرحلہ بتائی جبکہ دوسرے مورخ اور جغرافیہ نویس صرف پانچ مرحلہ بتاتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس نے نصر کے حوالہ سے "قصبۃ بلاد الھند" (بلاد ہند کا دار الحکومت) بتانے کے بعد اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، اور سندان کو وہ حیثیت نہیں دی ہے جو دار السلطنت کی ہونی چاہیے، وہ لکھتا ہے کہ معلوم نہیں نصر نے اسے بلاد ہند کا دار السلطنت کہکر کیا مراد لی ہے، کیونکہ قصبہ عرف عام میں صوبہ یا علاقہ کا سب سے بڑا مقام ہوتا ہے، اور ہندوستان میں سندان نامی کوئی ایسا شہر معلوم نہیں ہے، جو قصبہ کے مانند ہو، اور جس کو سندان کہتے ہیں وہ

لم توصف صفۃ ما یستحق	اس کی حیثیت وہ نہیں بیان کی گئی ہے۔

[2] معجم البلدان ج ۵ ص ۱۵۱

ان تکون قصبة الھند،	جس اس کا ہندوستان کا دار السلطنت ہونا معلوم ہو)

سندان کے "قصبۂ بلاد الھند" کہنے پر یاقوت حموی جیسے ماہر جغرافیہ کا حیرت کرنا بجائے خود حیرت واستعجاب کی بات ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ یاقوت کے نزدیک "دولت ماہانیہ" کی کوئی حیثیت نہ رہی ہو، اور وہ اسے ہنگامی غلبہ سمجھتا ہو یا پھر اسے سندان میں اس ریاست کے قیام کی خبر نہ ہو جو بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بلاذری کی کتاب فتوح البلدان سے اس نے معجم البلدان میں جگہ جگہ مدد لی ہے، اور اس کی عبارتیں نقل کی ہیں، اور اسی کتاب میں باب فتوح السند کے آخر میں دولت ماہانیہ کے قیام اور عروج وزوال کے حالات درج کیے ہیں۔

سندان کی مرکزیت اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندان کی اہمیت و مرکزیت کو بھی عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی زبانی بیان کر دی جائے تاکہ معلوم ہو جائے، کہ یہ مقام بھی تھانہ، سوپارہ اور جیمور کی طرح اپنے زمانہ میں صنعت و حرفت اور تجارت کا مرکز تھا، اور یہاں سے عرب ممالک کی تجارت قائم تھی، اور عرب و ہند کے لوگ ایک دوسرے کے حالات سے اچھی طرح باخبر تھے۔

ابوزید سیرافی (موجود ۲۶۴ھ) نے اپنے سفرنامہ میں مملکت بلہرا کے کچھ حالات جس میں سندان بھی شامل ہے، لکھکر کہتا ہے۔

ولقد اخبرنا بھذا من لانتھمہ	ہمیں ان واقعات کو ایسے شخص نے سنایا ہے
وھو الیوم متعارف بین الناس	جسے ہم جھوٹا نہیں کہہ سکتے، یہ شخص آج کل لوگوں
اذ کانت ھذہ البلاد من	میں متعارف ہے (غالباً مسعودی جناب مروج الذہب)
الھند تقرب من بلاد العرب[1]	نیز ہندوستان کے یہ شہر عرب کے شہروں سے قریب ہیں،

[1] رحلۃ ابی زید سیرافی

جس طرح اس زمانہ میں مسلمان تاجر عرب ممالک سے یہاں آتے تھے، اسی طرح یہاں کے ہندو تاجر سیراف وغیرہ آتے جاتے تھے، ابوزید سیرافی نے ہندوؤں کے الگ الگ کھانے کے حال میں لکھا ہے۔

فاذا ورد وا سیراف فدعاھم	جب ہندو تاجر سیراف آتے ہیں اور کوئی بڑا
وجیہ من وجوہ التجار وکانوا	مسلمان تاجر ان کی دعوت کرتا ہے تو ان
مائة انفس او دونھا او فوقھا	سینکڑوں ہندوؤں کے لیے اسے ہر ہر
احتاج ان یضع بین یدی	آدمی کے سامنے طشت رکھنا پڑتا ہے
کل رجل منھم طبقا فیہ ما یاکلہ	جس میں ہر ایک کے کھانے کی چیزیں الگ
لا یشارکہ فیہ سواہ[1]	الگ موجود ہوتی ہیں،

سندان کی تجارتی اور صنعتی اہمیت یہ تو مملکت بلہرا کے عام حالات اور عربوں اور ہندوؤں کے تعلقات کے متعلق بیانات تھے، پھر سندان کے بارے میں ان ہی جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے تصریح کی ہے کہ وہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا، اور یہاں سے دور دور تجارتی قافلے بری اور بحری راستوں سے آتے جاتے تھے، اور اس کی بندرگاہ تجارتی سامانوں سے پٹی رہتی تھی، ابوالفداء کا بیان ہے:

ومدینة سندان مجمع الطرق	سندان شہر مختلف سمت کے راستوں کا
قال وسندان بلاد القسط	مرکز ہے، اور یہ قسط، بانس اور بید
والقنا والخیزران، وھی اجل	کا دیس ہے، اور سمندر پر ان اطراف کی
فرضة علی البحر[2]	سب سے بڑی بندرگاہ ہے،

سندان صرف تجارتی مرکز نہیں بلکہ صنعتی مقام بھی تھا اور یہاں بہت عمدہ جوتے تیار

[1] رحلۃ ابی زید سیرافی [2] تقویم البلدان ذکر سندان

ہوتے تھے، جو کنبائت اور منصورہ سے "النعال الکنبانیہ" (کھمبائت کے جوتے) کے نام سے عرب ممالک جاتے تھے۔ اسی طرح یہاں ہر قسم کے عمدہ عمدہ کپڑے تیار ہوتے تھے، اور زیادہ مقدار میں باہر جاتے تھے، اور دنیا کے مشہور اور بہترین کپڑوں کا مقابلہ کرتے تھے،

مسعودی کنبائت کے ذکر میں لکھتا ہے،

وھی المدینۃ التی تضاف الیھا
النعال الکنبائیۃ الواردۃ،
وفیھا تعمل وفیما یلیھا مثل
مدینۃ سندان وسوبارہ[1]

کنبائت وہی مقام ہے جس کی جانب کنبائتی جوتوں کی نسبت ہے، یہ جوتے عرب ممالک میں آتے ہیں اور خود کھمبائت اور اس کے قریب سندان اور سوبارہ میں بنائے جاتے ہیں،

مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں لکھا ہے،

ویحمل .... ومن سندان الارز
الکثیر وثیاب، ویعمل بسائر
الاقلیم من البسط وما یجری
مجراھا مایعمل بقھستان
خراسان ویحمل منہ نارجیل
کثیر، وثیاب حسنۃ ومن
المنصورۃ للنعال الکنباتیۃ
النفیسۃ[2]

سندان سے بھاری مقدار میں چاول اور کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں، فرش کی قسم کے کپڑے پورے علاقے میں بنائے جاتے ہیں، جیسے خراسان کے علاقہ قہستان میں بنتے ہیں، اور سندان سے بڑی تعداد میں نارجیل اور بہترین کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں اور منصورہ سے کنبائتی نفیس جوتے باہر جاتے ہیں،

سندان میں چاول، شہد، نارجیل، کیلے، آم، مرچ، ساگوان، بید اور بانس، بکثرت

---

[1] مروج الذہب [2] احسن التقاسیم ص ۴۸۱

ہوتا تھا اور عرب ممالک میں بڑی مقدار میں بھیجا جاتا تھا، اس کی سب سے پہلی مثال ہمیں خود سندان کے خودمختار حکمرانوں کے حالات میں ملتی ہے، جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے، اس کے بانی فضل بن ماہان نے خلیفہ مامون کے پاس یہاں سے ہاتھی بھیجا،

وبعث الی المامون رحمہ اللہ
بفیل وکاتبہ

مامون کے پاس ہاتھی کا تحفہ بھیجا اور خط وکتابت کی،

اور اس حکومت کے تیسرے اور آخری حکمران ماہان بن فضل بن ماہان نے خلیفہ متوکل کے پاس ساگوان کی ایسی لکڑی بھیجی جس کی نظیر نہیں ملتی تھی،

واھدی الیہ ساجا لم
یر مثلہ عظاوطولا
(فتوح البلدان ص ۴۲۳ و ۴۳۳)

اس نے ساگون کی ایسی لکڑی روانہ کی کہ اس جیسی لکڑی لمبائی چوڑائی میں دیکھی نہیں گئی،

ابن خرداذبہ کا بیان ہے،

وبھاساج وقنا

یہاں پر ساگوان اور بانس پایا جاتا ہے،

دوسری جگہ بحری راستہ سے برآمدی اشیاء کے ضمن میں لکھا ہے،

ومن ملی وسندان الفلفل

ملی (ملیبار) اور سندان سے مرچ کی سپلائی ہوتی ہے،

ابن الفقیہ ہمدانی (م ۲۹۰ھ) نے کتاب البلدان میں لکھا ہے،

والفلفل من ملی وسندان[2]

مرچ ملی (ملیبار) اور سندان سے باہر جاتی ہے،

سندان کی زرخیزی اور ارزانی

سندان اور اس کے اطراف کے علاقے نہایت زرخیز اور سرسبز اور شاداب تھے، وہاں کی کھیتی خوب ہوتی تھی اور ہر طرف ارزانی تھی، یہاں کی پیداوار مقامی ضرورت سے

---

[1] المسالک والممالک ص ۶۲ اور ص ۷۰، ۷۱

فاعل کثیر مقدار میں غیر ممالک کو روانہ کی جاتی تھی، چنانچہ اصطخری نے تاہل، سندان، جیمور اور کنبایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

وھی مدن خصبة واسعة	یہ بستیاں زرخیز و شاداب اور وسیع ہیں،
وبھا النارجیل، والموز، والنبج	یہاں نارجیل، کیلہ اور آم پیدا ہوتا ہو
والغالب علی زروعھم الارز	اور چاول کی کاشت زیادہ ہوتی ہے، یہاں
وبھا عسل کثیر، ولیس بھا نخیل[1]	شہد بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے، البتہ کھجور نہیں ہے

اصطخری ہی کا بیان ہے

ومن تاھل الی کنبایة مفاوز	تاہل سے کنبایت تک چٹیل میدان
ثم یکون حینئذٍ من کنبایة	ہیں، پھر کنبایت سے جیمور تک ہندوستان
الی صیمور قری متصلة و	کی مسلسل بستیاں اور آبادیاں ہیں،
وعمارة للھند	

مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں لکھا ہے،

وقصبة سندان وصیمور	سندان کی بندرگاہ اور جیمور اور کنبایت
وکنبایة مدن خصبات	سرسبز و شاداب بستیاں ہیں، یہاں
رخیصة الاسعار، ومدن	اشیا ارزاں ہیں اور یہ بستیاں چاول اور
الارز، والعسل[2]	شہد کی کان ہیں،

سندان کی بحری تجارت

سندان کی اس ارزانی، سرسبزی، تجارت، صنعت و حرفت اور ہر طرح کی تجارتی مرکزیت نے اسے عربوں کی بہت بڑی منڈی بنا دیا تھا، اور سیراف، عمان، بحرین وغیرہ

[1] مسالک الممالک ص ۱۰۲ [2] احسن التقاسیم ص ۴۸۴

سے بڑے بڑے تجارتی جہاز براہ راست سندان آتے جاتے تھے، بزرگ بن شہریار ناخدا ابرام ہرمزی نے "عجائب الہند" میں کئی ایسے تاجروں کے حالات لکھے ہیں، جو سندان سے تجارت کرتے تھے، اور یہاں آتے جاتے تھے، ایک تاجر کا یہ واقعہ خود اسی کی زبانی تفصیل سے نقل کیا ہے کہ میں ۳۰۰ھ میں سیراف سے جیمور کے لیے جہاز سے چلا، ہمارے جہاز کے ساتھ ہی عبد اللہ بن جنید اور سبا کے جہاز بھی روانہ ہوئے،

وکانت ھذه الثلاثة مراکب	یہ تینوں جہاز بہت بڑے تھے اور بحری
فی نہایة الکبر ومن المراکب	جہازوں میں مانے ہوئے تھے، ان کے
الموصوفة فی البحر ونواخذتہا	ناخدا مشہور اور نامی گرامی تھے، بحری
مشہورون، لہم قدر	مسافروں میں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی،
ومنزلة فی البحر، وفی المراکب	ان جہازوں میں بارہ سو آدمی تاجروں
الف ومأتان رجل من التجار	ناخداؤں اور ملازموں وغیرہ اور مختلف
والنواخذة والبانانیة	طبقوں کے تھے، ان میں اس قدر مال
والتجار وغیرہم من صنوف	اور سامان تھا جس کی مقدار معلوم نہیں،
الناس وفیہا من الاموال و	ہم ان جہازوں کو لیکر چلے اور گیارہ
الامتعة مالا یعرف مقداره	دن کے بعد ہم نے پہاڑوں کے آثار
کثرة، فلما سرنا احد عشر	اور سرزمین سندان، تھانہ
یوماً رأینا آثار الجبال ولواح	اور جیمور کی جھلکیاں دیکھیں،
ارض سندان وتانہ وصیمور[1]	

اس کے بعد یہ تینوں تجارتی جہاز سخت طوفان میں گھر گئے، اس کے تمام مسافر اور کل

[1] عجائب الہند ص ۱۶۵

سامان تجارت سمندر کی نذر ہو گئے، صرف تین آدمی بچ سکے،

اسی طرح بزرگ بن شہریار نے جیمور نے ہنرمن (قاضی) عباس بن ماہان کی زبانی ایک تاجر کا واقعہ نقل کیا ہے، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔

ان بعض التجار اخبرہ عن نفسہ	ایک تاجر نے خود مجھ سے بیان کیا ہے کہ اس نے
انہ جہز مرکبا من سندان	سندان یا جیمور کی بندرگاہ سے ایک
او صیمور الی عمان الشدہ منی [۱]	تجارتی جہاز روانہ کیا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس تاجر نے اپنے وکیل کی معرفت اس جہاز میں ساج کی ایک لمبی چوڑی لکڑی روانہ کی اور اس پر اپنا نام اور مارکہ لکھ دیا اور کہا کہ اسے فروخت کرکے عمان سے میرے لیے فلاں فلاں سامان خرید لینا، اس واقعہ کے دو ماہ بعد ایک آدمی نے اس تاجر کو خبر دی کہ سندان کی کھاڑی میں ایک لمبی چوڑی لکڑی بہ کر آئی ہے جس پر تمھارا نام درج ہے، وہ تاجر دوڑا ہوا گیا اور دیکھا تو وہی لکڑی تھی، جو فروخت ہونے کے بعد طوفان کی وجہ سے ساحل عمان سے بہہ کر پھر سندان کے کنارے پر آ گئی تھی،

بزرگ بن شہریار نے حسن بن عمرو نامی ایک عرب کی زبانی ہندوؤں کے چھوت چھات کا چشم دید واقعہ لکھا ہے، جسے اس تاجر نے قیام سندان کے زمانہ میں دیکھا تھا [۲]،

سندان سے متعلق عرب سیاحوں اور تاجروں کی زبانی اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ اپنے عروج کے زمانہ میں کس قدر اہم تھی، اور اسے کتنی مرکزیت حاصل تھی،

سندان وغیرہ میں مسلم ثقافت کی کیفیت

سندان صرف تجارتی اور معاشی منڈی نہ تھی بلکہ یہاں علمی اور دینی چرچا بھی تھا، اور دوسرے ساحلی مقامات کی طرح سندان بھی مسلمانوں کی اجتماعی اور ثقافتی

[۱] عجائب الہند ص ۱۴۴، [۲] ایضاً ص ۱۱۸

زندگی کا مرکز تھا، اور بلہرا کے راجے اور ان کی رعایا مسلمانوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور ان کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی، عربوں اور مسلمانوں سے ان کی محبت کا حال پہلے معلوم ہو چکا ہے، اب بعض ایسے شواہد پیش کیے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ سندان اور اس کے آس پاس جیمور، سوپارہ، کنبایت، تھانہ وغیرہ میں مسلمانوں کا دینی اور مذہبی حال کیا تھا،

اس سلسلہ میں سب سے پہلے خود سندان ہی کا واقعہ ہے کہ وہاں دولت ماہانیہ کے بانی نے ایک جامع مسجد بنوائی تھی جس میں وہ خلیفہ مامون کے نام کا خطبہ پڑھتا اور اس کے لیے دعا کرتا تھا، اس کے بعد اس کے دونوں بیٹوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں اس کو جاری رکھا اور جب سندان سے اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو مقامی ہندوؤں اور حکمرانوں نے اس مسجد کو برقرار رکھا، مسلمانوں کو اس کی اجازت دی، وہ اس میں نماز پڑھا کریں اور اپنے خلیفہ کیلئے دعا کیا کریں، بلاذری کا بیان ہے:

ودعا لہ فی مسجد جامع اتخذہ	فضل بن ماہان نے مامون کے لیے اس جامع مسجد
بہا... ثم ان الہند بعد غلبوا	میں دعا کرائی جسے اس نے وہاں پر تعمیر کیا تھا،
علی سندان فترکوا مسجدہا	بعد میں سندان پر جب ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا
للمسلمین یجمعون فیہ ویدعون	تو انھوں نے اس مسجد کو مسلمانوں کو دیدیا کہ
للخلیفۃ (ص ۴۳۴)	وہ اس میں نماز پڑھیں اور اپنے خلیفہ کے لیے دعا کریں

مسعودی نے بلاد جیمور "یعنی جیمور کے اطراف و جوانب کے مقامات کا چشم دید حال تفصیل سے لکھا ہے، جس سے یہاں کے مسلمانوں کے عام حالات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، اس کا بیان ہے:

ولقد حضرت بلاد صیمور	جیمور ہندوستان میں علاقہ لار میں واقع ہے
من بلاد الہند من ارض اللار من	جو بلہرا کی مملکت کا ایک ٹکڑا ہے، میں بلاد جیمور میں
مملکۃ البلہرا وذلک فی سنۃ	۳۰۴ھ میں پہنچا، اس وقت جیمور کا حاکم جانج

اربع وثلث مائة والملك يومئذ — نامی ایک شخص تھا، یہاں تقریباً دس ہزار
على الصيمور المعروف بحاج — مسلمان آباد ہیں، جن میں بیاسرہ، سیرافی،
(بجانج) وبها من المسلمين — عمانی بصری، بغدادی اور دوسرے اسلامی
نحو من عشرة آلاف قاطنين — شہروں کے لوگ شامل ہیں، یہ لوگ یہاں
بياسرة، وسيرافيين وعمانيين — متاہل ہو کر مستقل آباد ہو گئے ہیں،
وبصريين، وبغداديين وغيرهم — ان مسلمانوں میں بڑے بڑے تاجروں کا
من سائر الامصار ممن قد — بھی ایک گروہ ہے، جیسے موسیٰ بن اسحق
تاهل وقطن تلك البلاد وفيهم — صندابوری، اور جیمور کی ہنرمنی کے عہدہ
خلق من وجوه التجار مثل موسى — پر آج کل ابوسعید معروف بن زکریا
بن اسحق الصندابوري، وعلى — ہے، ہنرمنی کا مطلب مسلمانوں کی
الهزمة يومئذ ابوسعيد معروف — سربراہی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ممتاز
بن زكريا وتفسير الهزمة — مسلمانوں میں سے ایک آدمی اس عہدہ
يراد به راسة المسلمين — پر مقرر ہوتا ہے اور ان کے تمام دینی معاملات
يتولاها رجل منهم من رؤسائهم — اسی سے متعلق ہوتے ہیں، اور بیاسرہ سے
تكون احكامهم مصروفة — مراد وہ مسلمان ہیں جو ہندوستان
اليه. ومعنى قولنا البياسرة — میں پیدا ہوئے ہے، یہ ان کا لقب ہے،
يراد به من ولد من المسلمين — ایک کو بیسر اور زیادہ کو بیاسرہ
بارض الهند يدعون هذا اللقب — کہتے ہیں۔
واحدهم بيسر وجمعهم بياسرة[1]

[1] مروج الذہب

اصطخری نے ان مقامات کے نام کی تصریح کی ہے جو بلہرا کی حکومت میں واقع تھے اور ان میں مسلمان کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، ان میں سندان بھی ہے۔ اس نے لکھا ہے،

وبقامهل، وسندان وصيمور — تامہل، سندان، جیمور، کنبایت میں جامع مسجدیں
وكنباية مسجد جامع وفيها — ہیں اور ان مقامات میں مسلمانوں کے دینی احکام
احكام المسلمين ظاهرة[1] — داوامر جاری ہیں یعنی آزادی سے ان پر عمل ہوتا ہے،

مقدسی بشاری نے سندان اور اس کے قریبی شہروں کو صوبہ دہینہ میں شمار کیا ہے، پھر لکھا ہے،

والغلبة بقنوج وبدهينة للكفار — قنوج اور دہینہ میں غلبہ کفار کا ہے، مگر
وللمسلمين سلطان على حدة[2] — مسلمانوں کے لیے علیحدہ حاکم ہوتا ہے۔

بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی نے مملکت بلہرا کے بعض قوانین و تعزیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

وان سرق مسلم ببلاد الهند — ہندوستان میں اگر کوئی مسلمان چوری کرتا ہے
رد الحكم في امره الى هنرمن المسلمين — تو اس کا قضیہ مسلمانوں ہی کے ہنرمن کے سپرد
ليعمل بما يوجبه حكم الاسلام وهنرمن — کر دیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق
من هو مثل القاضي في بلاد — عمل کرے، ہنرمن کی مثال بلاد اسلام
الاسلام ولا يكون هنرمن — کے قاضی کی ہے، ہنرمن صرف
الا من المسلمين[3] — مسلمان ہی ہوتا ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ بلاد جیمور میں مسعودی نے ۳۰۴ھ میں ابوسعید معروف بن زکریا ہنرمن سے ملاقات کی تھی، بزرگ بن شہریار ناخدا نے جیمور ہی میں سیراف کے رہنے والے ایک دوسرے ہنرمن عباس بن ماہان کا تذکرہ کیا ہے، اور عجائب الہند میں اس کی زبانی یہاں کے واقعات نقل کیے ہیں، ایک جگہ اس نے لکھا ہے،

[1] المسالک والممالک ص ۱۷۹ [2] احسن التقاسیم ص ۴۸۵ [3] عجائب الہند ص ۱۶۰ و ۱۶۱

انه کان بصیمور رجل من اهل سیراف	صیمور میں اہل سیراف سے ایک شخص عباس
یقال له العباس بن ماهان، وکان	ابن ماہان نامی تھا، وہ صیمور میں مسلمانوں کا
هنرمن المسلمین بصیمور وجه البلد	ہنرمن (قاضی) تھا اور شہر کے مسلمانوں
والمنضوی الیه من المسلمین[1]	میں سربرآوردہ تھا؛

ایک حکایت بھی اس کی زبانی بیان کی ہے،

ومن الاخبار الظریفة ما حدثنی به	عجیب خبروں میں ایک خبر یہ ہے جسے مجھ سے عباس
العباس بن ماهان هنرمن صیمور[2]	بن ماہان صیمور کے ہنرمن نے بیان کیا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں سندان کے قریبی شہر صیمور کے ذکر میں لکھا ہے

وهو من عمل ملك من ملوکهم یقال له	یہ جگہ بلہرا راجہ کی عملداری میں ہے جو کافر ہے، مگر صیمور
بلهرا کافر، الا ان صیمور وکنامة (کنبایة)	اور کنبائت ان شہروں میں ہیں جن میں مسلمان رہتے
من بلاد فیها مسلمون ولا یلی علیهم من	ہیں اور انکا حاکم بلہرا کیطرف سے صرف مسلمان ہوتا ہے
قبل بلهرا الا مسلم وبها مساجد جامع تجمع فیه الجماعات[3]	یہاں جامع مسجد بھی ہے جسمیں جمعہ و جماعت ہوتی ہے،

تھانہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

واهل هذا الساحل جمیعهم کفار یعبدون الانداد والمسلمون سکان معهم[4]	اس ساحلی علاقہ کے تمام باشندے کافر ہیں اور بت پوجتے ہیں اور مسلمان انکے ساتھ رہتے سہتے ہیں،

قامہل کے بیان میں لکھا ہے۔

ولاهل قامهل مسجد جامع تقام	قامہل کے مسلمانوں کی جامع مسجد ہے جس میں
فیه الصلوٰة للمسلمین[5]	مسلمان نماز پڑھتے ہیں،

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندان اور اسکے اطراف میں مسلمان ہر طرح سے مطمئن اور اپنے مذہب پر عمل کرنے میں پوری طرح آزاد تھے اور اس سلسلہ میں راجہ بلہرا کیطرف سے آسانیاں فراہم کیجاتی تھیں اور یہاں کے عوام بھی مسلمانوں کا بہت خیال کرتے تھے۔

(باقی)

[1] عجائب الہند ص ۱۴۲ [2] تفصیل کیلئے دیکھئے ص ۱۴۴ [3] معجم البلدان ج ۵ ص ۴۰۰ [4] ایضاً ص ۱۶ [5] ایضاً ج ۴ ص ۱۸

امام لغت حسن بن محمد الصغانی اللاہوری

مولانا عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۳)

جیسا کہ اوپر گذر چکا، صغانیؒ کول میں حاکم کول حسام الدین اوغلبک کے فرزند کے اتالیق تھے، ۵۹۵ھ میں حج کی ادائیگی اور دربار رسول کی حاضری کا خیال ہوا، فوراً رخت سفر باندھا، عسرت کا یہ حال تھا کہ پاؤں میں جوتے تک نہ تھے، بازار جاکر نیا جوتا خریدا اور بغیر اطلاع کیے کول سے روانہ ہوگئے، وارفتگی کے عالم میں ایک منزل کی مسافت تو طے کرلی مگر تھک کر چور ہوگئے۔ اور یہ اندازہ ہوگیا کہ راستہ پاپیادہ طے نہیں ہوسکتا، اسی فکر میں تھے کہ غیب سے سامان ہوگیا، آپ کی روانگی کی خبر والی کول کے فرزند کو ہوگئی، وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا حاضر خدمت ہوا، صغانی نے دیکھکر دل میں خیال کیا کہ اگر یہ گھوڑا دیدے تو سفر بآسانی طے ہو جائے، لڑکے نے واپس چلنے کی درخواست کی، صغانیؒ نے انکار کردیا وہ اصرار کرتا رہا، مگر مولانا انکار فرماتے رہے، جب اسے یقین ہوگیا کہ واپس نہیں جائیں گے تو اس نے عرض کیا، اگر مراجعت کی درخواست قبول نہیں ہوتی تو اس گھوڑے کو قبول فرمائیں، صغانیؒ نے گھوڑا لے لیا اور روانہ ہوگئے، خواجہ نظام الدین اولیاء کا بیان ہے

چوں از کول عزیمت حج کرد، نعلین بخرید در پائے کرد، چوں یک منزل رسید ماندہ شد، دانست کہ پیادہ نتواند رفت، ہمدراں اندیشہ بود کہ پسر والی کول سوار شدہ

دوان بیاید، تا اورا بازگرداند چوں آنجا آمد، مولانا را نظر بروے افتاد و اورا دید کہ براسپ سوار شدہ می آید در خاطر کرد کہ اگر ایں اسپ مرا دہد من آسودہ توانم رفت دریں فکرت بود کہ پسروالی بیاید. مولانا را بجہت بازگردانیدن بسیار الحاح کرد، مولانا بازنگشت چوں پسروالی دید کہ البتہ باز نخواہد گشت گفت حالا ایں اسپ کہ بروسوار آمدہ ام قبول کن. مولانا اسپ بستد و روان شد"[1]

صغانیؒ نے ہندوستان کی پوری مسافت اسی گھوڑے پر طے کی اور سندھ کے راستہ سے عراق ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔

حجاز میں قیام | حجاز ہمیشہ سے علماء و صلحاء کا مرکز رہا ہے، یہیں صغانی نے شیخ الحرم ابو الفتوح الحصری سے صحاح ستہ وغیرہ کا سماع کیا اور مدینہ جاکر بئر بضاعہ کی پیمائش کی جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

صغانی کا ایک مدت تک یہاں قیام رہا، مگر بیشتر زمانہ حرم کی مجاورت میں گذرا، مورخ کفوئی کا بیان ہے،

قد اقام بمكة مجاورة مدة[2] — صغانی ایک زمانہ تک مکہ معظمہ میں مجاور رہے ہیں۔

صغانیؒ کا قیام حجاز میں کم و بیش پانچ برس رہا ہے۔ جس کا بیشتر حصہ حرم بیت اللہ میں گذرا، اسی لیے وہ اپنی تحریروں کے آغاز اور اختتام پر عموماً الملتجی الی حرم اللہ کے الفاظ لکھتے تھے۔ ابن ابی مخرمہ المتوفی ۹۰۳ھ کا بیان ہے۔

جاور بالحرمين الشريفين — آپ نے کئی برس حرمین شریفین کی مجاورت

---

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد طبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ص ۴۰۔ [2] الاعلام الاخیار مخطوطہ ٹونک ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

سنين عديدة و تسمى بالملتجى الى حرم الله[1] — کی اور الملتجی الی حرم اللہ کے نام سے موسوم ہوئے۔

صغانیؒ کے حجاز میں اس طویل قیام کا مقصد جہاں مجاورت بیت اللہ اور حج و زیارت کی نعمت سے بار بار سرفراز ہونا تھا وہاں نامور محدثین سے حدیث کا سماع، محاورت عرب و امثال عرب کی تحقیق اور مقامی چیزوں کا مشاہدہ بھی کرنا تھا۔

قیام حجاز ہی کے زمانہ میں صغانی نے پہلی مرتبہ ارینۃ گھاس کا مشاہدہ کیا تھا۔ العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

قال شمر الارينة وهي	علامہ شمر کا بیان ہے کہ ارینہ
نبات يشبها الخطمي عريض	ایک ایسی گھاس ہے جس کے پتے
ورق وقال الصغانى	چوڑے ہوتے ہیں اور وہ خطمی سے
مولف هذا الكتاب اول	مشابہ ہوتی ہے، اس کتاب کا مولف
ما رأيت الارينة سنة	صغانی کہتا ہے، میں نے پہلی مرتبہ
خمس و ستمائة دون	۶۰۵ھ میں ارینہ کو جمرۃ العقبہ
جمرة العقبة بينها و	کے پاس اور جبل حراء کے درمیان
بين جبل حراء[2]	دیکھا تھا،

یہی وجہ ہے کہ صغانی نے ان لغت نویسوں کی جنھیں اہل عرب سے بالمشافہ اخذ لغت کا فخر حاصل ہے، بہت سی ایسی چیزوں میں ان کی تردید کی ہے جن کا تعلق سرزمین

---

[1] کتاب تاریخ ثغر عدن، طبع لیڈن ۱۹۳۶ء ج ۲ ص ۵۸ [2] العباب الزاخر، روٹوگراف سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، لفظ (خلق)، نیز تاج العروس مادہ حق

عرب ہی سے ہے، چنانچہ جوہری نے صحاح میں لفظ اعلیط کے معنی ورق المرخ کے لکھے ہیں، صغانی اسی کے متعلق لکھتے ہیں کہ جوہری کا یہ بیان صحیح نہیں، سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ناقل ہیں،

قال الجوہری الاعلیط ورق | جوہری نے کہا ہے اعلیط، مرخ (درخت)

المرخ قال الصاغانی وھو غیر | کے پتوں کو کہتے ہیں، صاغانی نے کہا

سدید لان المرخ لا ورق | ہے، جوہری کے یہ معنی لکھنا ٹھیک نہیں،

لہ وعیدانہ سلبۃ | مرخ کے تو پتے ہی نہیں ہوتے، اسکی

وھی قضبان دقاق[1] | ٹہنیاں خشک ہوتی ہیں اور وہ بھی

باریک باریک اور لمبی۔

یہی انداز صغانی کا امثال عرب کی تحقیق میں بھی ہے، عرب میں ایک مثل مشہور ہے،

فی کل شجر نار واستمجد | ہر درخت میں آگ ہے تم مرخ اور عفار

المرخ والعفار[2] | (یہ بھی درخت ہیں) کو حاصل کرو (کیونکہ یہ دونوں بہترین ہیں)۔

یہ ضرب المثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جہاں کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر ترجیح دینی ہوتی ہے، نیز چقماق کا اوپر والا حصہ مرخ اور نیچے والا حصہ عفار کے نام سے پکارا جاتا ہے، صغانی اس کے متعلق اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے مرخ کو مکہ کے راستہ میں مقام قدید[3] میں دیکھا تھا، سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:

---

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ (علط) [2] تفصیل اور تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو مجمع الامثال للمیدانی المتوفی ۵۱۸ھ طبع مصر ۱۳۴۲ھ ج ۲ ص ۱۸ [3] قدید، سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس (مادہ قد) میں ابن الاثیر الجزری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ قدید، مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کے ایک گھاٹ کا نام ہے، یہ مقام غار ثور سے آگے ہے، ہجرت کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور سے آکر یہیں قیام فرمایا تھا، صغانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری تک یہ مقام متعین تھا، سال کے تغیرات نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے۔

قال الصغانی اول دماء رأیت | صغانی فرماتے ہیں مرخ میں نے پہلی مرتبہ

سنۃ خمس وستمائۃ بقدید | ۶۰۵ھ میں قدید کے اندر خیمتی ام معبد

عند موضع خیمتی ام معبد[1] | رضی اللہ عنہا کے پاس دیکھا تھا، اور

---

[1] ام معبد۔ آپ کا نام عاتکہ اور کنیت ام معبد ہے، آپ وہی مشہور صحابیہ ہیں جن کے یہاں ہجرت کے موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار ثور سے آکر فروکش ہوئے تھے، ان کا مکان مقام قدید میں تھا۔ شاعر کے حسب ذیل شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے

جزی اللہ رب الناس خیر جزائہ | رفیقین قالا خیمتی ام معبد

اللہ تعالیٰ ان دونوں رفیقوں کو جزائے خیر دے | جنھوں نے ام معبد کے خیموں میں دو پہر کو آرام کیا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے یہاں رونق افروز ہوئے تو انھوں نے ایک بکری ذبح کرنے کے لیے پیش کی جو دودھ دیتی تھی۔ آپ نے اس کے تھن چھوئے اور فرمایا، اس کو ذبح نہ کرو، ام معبد رضی اللہ عنہا دوسری بکری لے آئیں اور اسے ذبح کرکے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو کھانا کھلایا، ام معبد رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔ جس بکری کے تھن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ لگایا تھا، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک ہمارے پاس رہی، ہم اسے صبح و شام دوہا کرتے اور اس کا دودھ پیا کرتے تھے۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کس سنہ میں مشرف باسلام ہوئیں، اس میں اختلاف ہے، بروایت محمد بن عمر آپ اسی زمانہ میں مسلمان ہو چکی تھیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد مطبوعہ یورپ ج ۸ ص ۲۱۲)

رضی اللہ عنہا واتخذت منہ الزناد لما کان بلغنی من قولھم فی کل شجر نار واستمجد المرخ والعفار[1]

میں نے اسی کی چقماق بنائی تھی، کیونکہ مجھے اہل عرب کی اس مثل فی کل شجر نار واستمجد المرخ والعفار کا علم تھا۔

یمن میں آمد | حجاز ہی میں ۶۰۵ھ میں غالباً صغانی نے یمن کے مشہور محدث قاضی ابراہیم بن احمد کا شہرہ سنا، چنانچہ اسی سال حجاز سے یمن آگئے اور وہاں احادیث کا سماع کیا، مورخ ذہبی تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں:

سمع بالیمن من القاضی ابراھیم بن احمد بن سالم القریظی[2]

یمن میں قاضی ابراہیم بن احمد بن سالم القریظی سے صغانی نے حدیث کا سماع کیا ہے،

قاضی ابراہیم نہایت بلند پایہ محقق، فقیہہ اور محدث تھے، ابن ابی مخرمہ المتوفی ۹۰۳ھ تاریخ ثغر عدن میں لکھتے ہیں:

ابو اسحٰق ابراھیم بن احمد بن عبداللہ بن محمد بن سالم القریظی الفقیہہ الشافعی کان فقیہا نبیہا بارعاً محققاً قرأ الفقہ علی ابیہ وغیرہ

ابو اسحٰق ابراہیم بن احمد بن عبداللہ بن محمد ابن سالم القریظی، الفقیہ الشافعی نہایت بلند پایہ فقیہ اور محقق تھے، فقہ وغیرہ کی تحصیل اپنے والد اور دیگر فضلاء کی تھی، عدن کی خطابت ان کے خاندان

۱؎ نیز مجمع الامثال مولفہ نجم کرمانی طبع طہران ۱۲۹۰ھ ص ۱۵۴ ۔ ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ (علط) سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں اول رؤیتی فی المرخ والعفار بالدریھمی وھی قریۃ بالیمن سنۃ ۱۱۶۶ مرخ اور عفار کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۱۶۶ھ میں دریھمی میں دیکھا تھا، یہ یمن میں ایک بستی ہے۔ ۲؎ فی الاصل ابراہیم ابن احمد بن ابی سالم القریضی، ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

..... ولم تزل خطابۃ عدن بایدی ذریتہ ... واظن وفاتہ کانت فی العشرین الاولی من المائۃ السابعۃ

میں رہی ہے، میرا خیال ہے، ان کا انتقال ساتویں صدی کے اوائل میں ۶۲۰ھ کے مابین ہوا ہے۔

فقیہہ ابراہیم کی حیثیت محض شیخ اور استاد ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے، بلکہ انھیں بھی صغانی سے اخذ و تلمذ کی نسبت حاصل ہے، ابن ابی مخرمہ نے تاریخ ثغر عدن میں ایک موقعہ پر اس حیثیت کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

ابو محمد سعد بن مسعود المنجوی .... لم یذکرہ الجندی ولا الخزرجی ما یدل علی وصول الادیب سعد بن سعید المنجوی الی ثغر عدن وانما ذکرتہ ھنا لانی رأیت فی ثبت شیخ المحدثین فی عصرنا بالدیار الیمنیۃ عماد الدین یحیٰی العامری ما یدل علی دخولہ الی ثغر عدن وذلک انہ ذکر فیہ ان الادیب الرئیس سعد بن سعید المنجوی اخذ

ابو محمد سعد بن مسعود المنجوی .... ان کے بارے میں مورخ جندی اور خزرجی دونوں نے کوئی ایسی بات بیان نہیں کی جس سے سعد بن سعید المنجوی کے ثغر عدن میں آنے کا حال معلوم ہوسکتا، میں نے ان کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ میں نے اپنے دور کے یمنی شیخ المحدثین عماد الدین یحیٰی العامری کا ثبت[2] دیکھا ہے جس سے ان کی عدن میں آمد کا پتہ چلتا ہے، اس میں مذکور ہے کہ ادیب سعد بن سعید المنجوی خطب نباتیہ (مولفہ ابو یحیٰی عبدالرحیم ابن محمد بن محمد الفارقی المتوفی ۳۷۴ھ)

۱؎ تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۲ ۲؎ جس میں محدث اپنے شیوخ حدیث کے مختصر حالات اور اسناد جمع کرتا ہے،

الخطب النباتية عن القاضی	قاضی ابراہیم بن محمد القریظی سے عدن میں
ابراهیم بن محمد القریظی بعدن	پڑھتے تھے جس کی سند انھیں حسن بن محمد
باخذه لها عن الحسن بن محمد	الصنانی سے عدن میں حاصل ہوئی تھی،
الصغانی بعدن، کذا وجدته	اسی طرح میں نے حافظ عامری کے ثبت
فی ثبت الحافظ العامری و	میں لکھا ہوا دیکھا ہے اور اس عبارت کے
الظاهر ان قوله بعدن ظرف	سیاق سباق سے ظاہر ہے کہ اس میں
لاخذ المنجوی عن القریظی	بعدن لاخذ المنجوی عن القریظی
ولیس هو ظرف للقضاء المتصف	کا ظرف ہے اور یہ قضا کا ظرف نہیں ہے
به القریظی بدلیل ذکره ذلک	جس سے قریظی متصف ہیں، اس کی دلیل
ایضاً فی اخذ القریظی عن الصغا	یہ ہے کہ ایسا ہی اخذ القریظی عن الصغا فی
فالظاهر ان المنجوی المذکور	میں ہے، جس سے ظاہر ہے کہ منجوی مذکور
دخل عدن عند خروجه	کی عدن میں آمد، صغانی کے مکہ اور شام
الی مکة والشام فاخذ عن	کی طرف نکلنے کے بعد ہوئی ہے اور پھر
القریظی الخطب النباتیة	منجوی نے قریظی سے خطب نباتیہ کی سند لی ہے،
فلذلک ذکرته هنا [1]	اسی لیے میں نے ان کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے،

ان ہی ایام میں صغانی کی کشتی یمن کی حسب ذیل بندرگاہوں پر لنگر انداز رہی ہے، (۱) کنیسہ یہ زبید سے متصل بحر یمن کی ایک بندرگاہ ہے، صغانی العباب لزاخر میں رقمطراز ہیں۔

الکنیسة مرسی من مراسی بحر	کنیسہ، بحر یمن کی بندرگاہوں میں سے ہے،

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۹۱

الیمن مما یلی زبید الملجاءی	جو یمن سے مکہ کی راہ آنے والے کے لیے زبید سے
من مکة حرسها الله تعالیٰ	متصل ہے، صغانی اس کتاب العباب
قال الصغانی مؤلف هذا الکتاب	کا مولف کہتا ہے ۶۰۵ھ میں میں بھی
ارسیت بها سنة خمس وستمائة [1]	یہاں آیا ہوں،

(۲) فرسان، یہ بھی جزائر بحر الیمن میں ایک خوفناک جزیرہ ہے اور مخلاف سلیمانی کے مقابل واقع ہے، صغانی فرماتے ہیں:

فرسان مثال غطفان جزیرة	فرسان بروزن غطفان، جزائر یمن میں سے
ماهولة من جزائر بحر الیمن	ایک خوفناک جزیرہ ہے، صغانی نے
قال الصغانی مؤلف هذا الکتاب	اس کتاب کا مؤلف کہتا ہے ۶۰۶ھ
ارسیت بها ایام سنة خمس وستمائة [2]	میں میں یہاں آیا ہوں۔

(۳) مراک، یہ بھی عدن سے متصل بحر یمن میں ایک بندرگاہ ہے، یہاں کئی مرتبہ صغانی گئے ہیں، سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:

مراک کسحاب قال الصاغانی	مراک بروزن سحاب ہے، صغانی کہتا ہے
هو بالیمن علی ساحل البحر وفیه	یہ مقام یمن میں سمندر کے کنارہ واقع ہے
ترفأ السفن علی مرحلة من عدن	یہاں کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں، یہ عدن
مما یلی مکة حرسها الله تعالیٰ	کے اس علاقہ سے جو مکہ سے متصل ہے تقریباً
وقد ارسیت به مرارا و	ایک منزل کی مسافت پر واقع ہے، اس کشتی
اول ذلک کان ۶۰۵ھ [3]	سے یہاں بار بار آیا گیا ہوں اور پہلی مرتبہ

(بقیہ حاشیہ)

[1] ملاحظہ ہو العباب لزاخر (روٹوگراف) اد کنس نیز تاج العروس مادہ (کنس) [2] ایضاً ... (فرس) ..... (فرس)
[3] ،، تاج العروس مادہ (مرک)

(الف) ان ہی ایام میں کچھ دنوں یمن میں صغانی کا قیام محدث محمد بن بطال کے ساتھ بھی رہا ہے، اور ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے،

محدث محمد بن احمد بطال الرکبی، علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں یگانۂ عصر تھے، ارباب کمال سے کسب کمال کیا تھا، ابن ابی مخرمہ نے تصریح کی ہے کہ ایک نے دوسرے سے کسب فیض کیا ہے، ان کے الفاظ ہیں

واجتمع به الایام الحسن	یمن میں حسن بن محمد الصغانی اور
بن محمد الصغانی فاخذه	محدث ابن بطال کا کچھ عرصہ ساتھ رہا ہے
کل منهما عن الآخر[1]	اور ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے،

(ب) بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حج کے قرب کی وجہ سے صغانی یہاں سے مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور حج ادا کرنے کے بعد ۶۰۶ھ میں پھر یمن ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، اس مرتبہ حجاز سے آتے ہوئے جدہ میں عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں بنوائی تھیں، چنانچہ العباب الزاخر میں فرماتے ہیں،

قال الصغانی مولف هذا الکتاب	اس کتاب کا مولف صغانی کہتا ہے کہ میں نے
رأیت اهل نجدة منصرفی م	۶۰۶ھ میں حجاز سے یمن جاتے وقت اہل جدہ
من الحجاز الی الیمن سنة ست	کو دیکھا تھا کہ وہ عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں
وستمائة یحتذون احذیة	استعمال کرتے تھے، اسکی کھال کی جوتیاں
من جلد العنبر فتکون (قوی)	نہایت مضبوط اور پائدار ہوتی ہیں
وابقی وامتن وارض ما تحذ	میں نے بھی اس کا بنا ہوا جوتا خریدا تھا،

منه وقد انتعلت انا منها نعلا[2]

۱؎ ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن ترجمہ محمد بن احمد بطال الرکبی ۲؎ ملاحظہ ہو العباب الزاخر مادہ (عنبر) نیز تاج العروس، ادوہ مذکور، مگر تاج العروس میں اختصار ہے،

ہندوستان میں آمد اور یہاں کی سیاحت

(ت) ۶۰۶ھ میں صغانی ہندوستان واپس تشریف لائے، اس سے پہلے جتنے عرصہ یہاں رہے معلوم ہوتا ہے انھیں ملازمت کی وجہ سے سیر و سیاحت کا زیادہ موقع نہ مل سکا، اس مرتبہ آپ نے کہیں مستقل قیام نہیں کیا اور غالباً سارا وقت سیر و سیاحت میں گذرا، یہ زمانہ ہندوستان کی سیاحت کے لیے یوں بھی موزوں تھا کہ صغانی علوم میں اب پوری مہارت حاصل کر چکے تھے، طلبہ کی جماعت سفر و حضر میں آپکے ساتھ رہتی تھی، اسے پڑھاتے تھے، اور سیاحت کرتے تھے، صغانی کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا، ابن ابی مخرمہ کا بیان ہے

کان جوابا للبلاد	ملکوں، ملکوں سیر کرتے تھے،

صغانی خود ایک شعر میں فرماتے ہیں،

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاء	نفرق الدهر افراسی وارسانی

میں رفقا کی ایک جماعت کیساتھ عالم کی سیر کرتا تھا، گردش دوراں نے آخر میرے شہسواروں کو مجھ سے جدا کر دیا اور مجھے ایک جگہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کم سفر کرتے تھے، اور سفر و حضر میں رفقا کی ایک جماعت ساتھ رہتی تھی، یہ وہ جماعت تھی جو صغانی سے کسب کمال کرتی تھی، اس سے انکی قبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل طلب انھیں سفر تک میں نہیں چھوڑتے تھے،

صغانی نے ہندوستان (دوآبہ گنگ وجمن، سندھ اور پنجاب) کی سیاحت اس طرح کی کہ شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جہاں سے ان کا گذر نہ ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ جن مقامات کے متعلق کوئی بات لکھی ہے وہ حقیقت اور مشاہدہ پر مبنی ہے،

(ث) ابن عباد نے خلیل لغوی کے حوالہ سے المحیط میں اور ابن عزیز نے دیوان الادب و میدان العرب میں نقل کیا ہے کہ دکنکس[1] بروزن سفرجل ہندوستان کا ایک دریا ہے،

۱؎ دکنکس معلوم ہوتا ہو کہ اہل فرنگ نے اسی لفظ کنکس سے Ganges بنایا ہو، اس لفظ میں چونکہ ایک نوع کا ثقل تھا، غالباً اسکے ازالہ اور تحسین صوت کی غرض سے اہل عرب نے ابتدا میں دال کا اضافہ کیا ہے،

اس پر بحث کرتے ہوئے صغانی العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

انی شرقت و غربت فی الھند
والسند نیفا واربعین سنۃ
وشاھدت اکثر انھارھا
وبلغنی اسماء مالم اشاھد
منھا وھی تربی علی تسعمائۃ
نھر فلم ار ھذا النھر ولم اسمع
بہ فیمن لھم نھرا عظیما
اذا زاد الماء یکون عرضہ
فرسخا واذا نقص یکون مثلی عرض
دجلۃ فی زیادۃ الماء وکفار
الھند یحجون الیہ من اقطار
الھند فیتبرکون بہ ویحلقون
عندہ رؤسھم ولحاھم و
یسترجون فیہ موتاھم علی
السرار جاء تمحیص ذنوبھم
علی زعمھم من احرقوہ من
ماتاھم یذرون حممھ
ورمادہ فیہ وھو من اشھر

میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب
میں تقریباً چالیس برس گھوما پھرا ہوں اور
میں نے یہاں کے بیشتر دریاؤں کو دیکھا ہے
اور جن کو میں نے نہیں دیکھا ہے، انکے نام سُنے ہوں
کا مجھے علم ہے وہ نو سو سے اوپر دریا اور
نہریں ہیں، میں نے دگنگس نام کی کوئی نہر
نہ دیکھی ہے اور نہ سنی، سوائے اہل ہند کے
اس بڑے دریا کے کہ جس کا پانی جب بڑھ
جاتا ہے تو اس کا عرض ایک فرسخ ہوجاتا ہے
اور جب گھٹ جاتا ہے تو نہر دجلہ کے عرض
سے دوگنا رہ جاتا ہے، ہندوستان بھر کے
کافر اطراف ہند سے برنیت ثواب جاتے
ہیں اور اسے متبرک سمجھکر برکت حاصل
کرتے ہیں۔ اس کے کنارے اپنی داڑھیاں
اور سر منڈاتے ہیں اور تختوں پر اپنی میتوں
کو رکھکر دریا برد کرتے ہیں اور ایسا
اس امید پر کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل
سے ان کے گناہ دھل جاتے ہیں اور جو

انھارھم و اسمہ کنک
العباب الزاخر بحوالۃ تاج العروس
مادہ (رفص) . . . . .

ان میں جو لوگ اپنے مردے جلا دیتے ہیں
وہ انکی کھوپریاں اور انکی راکھ لاکر دریا میں ڈال دیتے
ہیں، یہ انکا مشہور دریا ہے اور اسی کا نام گنگ ہے۔

دیبل، سندھ کی مشہور بندرگاہ تھی، یہاں کے امراء کے متعلق صغانی کا بیان سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں،

دیبل .... قصبۃ بلاد
السند التی ترفاء الیھا السفن
قال الصاغانی اھلھا صلحاء
وامراءھا طلحاء قدیما وحدیثا
یکون قطاع طریق سفن
البحر ویضربون معھم بسھم
(تاج العروس مادہ "دبل")

دیبلؒ ...... بلاد سندھ میں ایک قصبہ ہے
جہاں پر بندرگاہ واقع ہے یہاں کشتیاں
لنگر انداز ہوتی ہیں، یہاں کے عام باشندے
نیک طینت ہیں، مگر قدیم امراء اور حکام ہی
نہیں بلکہ حال کے امراء اور حکام بھی بدطینت ہیں،
قزاقان بحری کیساتھ وہ رسم رکھتے ہیں اور لوٹ
کے مال میں اپنا حصہ بھی لیتے ہیں،

حدیثاً کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ دیبل ۶۴۰ھ تک آباد تھا،

[1] فتح سندھ کے اسباب میں ایک بڑا سبب اہل دیبل کی یہی بحری قزاقی کی دیرینہ عادت بھی تھی، یہ تاریخ سندھ کا مشہور واقعہ ہے کہ یہاں کے بحری قزاقوں نے خلیفہ عبدالملک کے عہد خلافت میں حاجیوں کے جہاز پر ڈاکہ ڈالکر قبیلہ یربوع کی بیوہ عورت کا بھی مال لوٹ لیا اور اس نے بے اختیار حجاج کو مدد کے لیے پکارا، جب اس واقعہ کی خبر اس کو ہوئی تو وہ غصہ سے بے تاب ہوگیا اور جوش میں آکر کہہ اٹھا کہ "میں آیا" یہی واقعہ آخر فتح سندھ کی تاریخی یادگار بنا، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان از ابوالحسن البلاذری مطبوعہ مصر ۱۹۳۲ء، نیز چچنامہ مؤلفہ علی بن حامد الکوفی، مطبع لطیفی دہلی ۱۹۳۹ء)

اسی سیر و سیاحت کا نتیجہ تھا کہ صغانی کو خصوصیت سے ہندوستان کے متعلق اپنی معلومات پر فخر تھا، چنانچہ العباب لزاخر میں جہاں کہیں ہندوستان کے متعلق کوئی بات کہی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے، ایک موقعہ پر رقمطراز ہیں:

قال اللیث رهطة رکایا	امام لغت لیث کا بیان ہو کہ رهطة
بالهند معربة یستقی منها	یہ لفظ معرب ہے اور ہندوستان کے
بالثیران قال الصاغانی	ایسے کنوؤں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے
اما ارض الهند فانا	جن سے پانی بیلوں کے ذریعہ کھینچا جاتا ہے،
ابن بجدتها وطلاع انجدها	صغانی کہتا ہے: سرزمین ہند سے تو
ولیت بها هذه الرکایا	میں خوب واقف اور اسکی پست و بالا
وانما الدولاب یسمی	زمینوں سے اچھی طرح باخبر ہوں ۔
بالهند ارهت فسمع بعض	ہندوستان میں رہٹ کنوؤں کو نہیں
السفر المستعربین المترددین	کہتے ہیں بلکہ دولاب کا نام ہے اور اسی کو
الی تلك البلاد یقولون	ہندی رہٹ بولتے ہیں، بعض ایسے مسافروں
ارهت فقال ارهط	نے جو عرب میں باہر سے آکر آباد ہوئے تھے
بالطاء فغیرها لیس	اور یہاں بھی گھوم پھر گئے انھوں نے یہ
فی کلامهم طاء ولا ینبئك	کلمہ اہل ہند سے سنا تو انھوں نے رہط کہا
مثل خبیر[1]	اور انھوں نے ٹ کو ط سے بدل لیا، کیونکہ
	اہل ہند کے یہاں طاء نہیں ہے، کوئی

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ رهط

جن پرانے مورخین سے ہندوستان یا سندھ کے متعلق ان کی کتابوں میں غلط معلومات درج ہو گئی ہیں تو صغانی نے موقعہ بموقعہ اس کی تصحیح کر دی ہے، چنانچہ مورخ ابو الحسن البلاذری المتوفی ۲۷۹ھ نے کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ بیلمان ہندوستان یا سندھ میں کوئی مقام ہے۔ اسی کی طرف سیوف بیلمانیہ منسوب ہیں۔ صغانی مجمع البحرین میں رقمطراز ہیں:

قال البلاذری فی الکتاب	بلاذری نے کتاب البلدان میں لکھا ہے
البلدان بیلمان بالسند	کہ بیلمان، ہندوستان یا سندھ میں
او الهند والیه ینسب	کوئی جگہ ہے اور اسی کی طرف بیلمانی تلواریں
السیوف البیلمانیه قال	منسوب ہیں، اس کتاب کا مولف صغانی
الصغانی مؤلف هذا الکتاب	کہتا ہو، ہندوستان اور سندھ میں
لا اعرف بالسند ولا بالهند	کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بیلمان کے
موضعا یقال له بیلمان[1]	نام سے مشہور ہو،

یہاں کم و بیش تین برس سیر و سیاحت میں گذارے پھر صغانی حج کے لیے روانہ ہوئے ۶۱۰ھ میں حج ادا کیا اور مکہ معظمہ سے عدن آگئے۔ (باقی)

[1] ملاحظہ ہو مجمع البحرین، دٹوگراف، سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی، مادہ "بلم" معلوم ہوتا ہے سید مرتضیٰ زبیدی کو مجمع البحرین کا یہ حصہ نہیں ملا تھا، اس لیے تاج العروس میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

آثارِ علمیہ و ادبیہ

خسرو

از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نومبر ۱۹۴۰ء میں غالباً دلی ریڈیو اسٹیشن سے خسرو پر ایک تقریر کی تھی، اس کا مسودہ اتفاق سے ان کے کاغذات میں مل گیا ہے، ہمارے علم میں یہ تقریر کہیں نہیں چھپی ہے اور معارف میں تو یقیناً نہیں چھپی ہے، اس لیے اسکو ایک علمی اور تاریخی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جاتا ہے۔ (م)

فارسی کے ان ہزاروں شاعروں میں سے جو ہندوستان کی خاک سے پیدا ہوئے بہت زیادہ ممتاز نام خسرو کا ہے، یہ نسل کے ترک تھے اور دہلی کے کہلاتے ہیں، لیکن ان کی پیدائش ہمارے ہی صوبہ میں ہوئی تھی، ایٹہ کے ضلع میں مومن آباد عرف پٹیالی ایک مقام ہے وہی ان کی جنم بھومی ہے، ۶۵۱ھ ان کی پیدائش کا سال ہے، ۷ سال کے بچہ تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے نانا عماد الملک کے گود میں جو بادشاہی فوجی افسروں میں تھے، پل کر جوان ہوئے ابھی بچپن ہی تھا کہ ان کی شاعری کی زبان کھل گئی اور ان کی یہ زمزمہ پردازی دن پر دن آگے بڑھتی گئی، وہ چودہ برس کے تھے کہ سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ میں حکومت کے تخت پر بیٹھا اس کے امیروں میں ملک چھجو کشلو خاں بڑا علم دوست اور نامور تھا، اس کی مجلس شام و عراق مصر و روم اور خراسان و ترکستان کے اہلِ کمال سے بھری رہتی تھی، امیر دو برس تک اسکے

دربار میں ملازم رہے، اسی کی شان میں کہا ہے،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح	ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشید ت کجا ست	آسماں روی ملک چھجو نمود

اسی کے دربار میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے بغرا خاں سے شناسائی ہوئی، وہ سامانہ کا حاکم تھا جو اب پٹیالہ کی ریاست میں ہے، امیر نے سامانہ کا رخ کیا تو بغرا خاں نے بڑی قدر کی اور مصاحب خاص بنایا، ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) کے حاکم طغرل نے جب بغاوت کی تو سلطان بلبن بغرا خاں کو لیکر خود بنگال گیا اور طغرل کو معزول کر کے بغرا خاں کو بنگال کا حاکم بنایا، یہ بلبل ہزار داستان بھی قفسِ دولت میں بغرا خاں کے ساتھ تھا، اور اس طرح دلی کا طوطی کچھ دنوں بنگال کی ترائی میں چہکتا رہا، مگر بنگال کی تر آب و ہوا دلی کی روحانی سرسبزی و شادابی کا بدل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے دلی چلے آئے، ان دنوں سلطان کا بڑا بیٹا سلطان محمد قاآن دلی میں تھا، اس نے ان کی آمد کی خبر سنی تو بلوا بھیجا، اور اپنے دربار میں جو اس کے ذاتی فضل و کمال اور قدر دانی کے سبب سے دنیا بھر کے اہلِ کمال کا مجمع تھا، جگہ دی، شہزادہ نے باپ سے ملتان کی حکومت پاکر ملتان کی راہ لی، تو اپنے تاج کے اس سب سے قیمتی ہیرے کو بھی ساتھ لے لیا، پانچ برس تک اس کے ساتھ ملتان رہے، شہزادہ کی تعریف میں خوب خوب قصیدے کہے، یہ وہ زمانہ تھا جب خیوا سے بغداد تک سارا ملک تاتاریوں کے حملوں سے خون کا سمندر بن رہا تھا جس میں تاتاری لشکر ادھر سے ادھر تیرتا پھرتا تھا، ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس سیلاب کو ملتان پر آکر روک دیا، تاتاری لشکر بھاگ کھڑا ہوا، شہزادہ اس گھمسان کے رن میں ظہر کی نماز ادا نہ کر سکا تھا، پانچ سو آدمیوں کے ساتھ ایک تالاب کے کنارے یہ فرض ادا کر رہا تھا کہ دو ہزار تاتاریوں نے یلغار کر کے اس کو شہید کر ڈالا، یہ دردناک حادثہ

۶۸۳ھ میں پیش آیا، شعر و سخن کا یہ بلبل بھی گرفتار کرکے بلخ بھیجا گیا، امیر نے اس قید کے زمانہ میں اپنے شہید محسن کے ایسے پر درد مرثیے کہے کہ جب وہ ہندوستان پہنچے تو جس نے سنا رو دیا،

واقعہ است یا بلا از آسمان آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلس یاران پریشاں شد چو برگ گل ز باد
برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو
پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

دو برس کے بعد رہائی پاکر دلی آئے اور دربار جاکر شہزادہ کا مرثیہ اس سوز و گداز سے پڑھا کہ سب تڑپ گئے، سلطان بلبن ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا، اس کی جگہ اس کا پوتا بغرا خاں کا بیٹا کیقباد بادشاہ ہوا، امیر اس کو چھوڑ کر خواجہ احسان کے ساتھ جو صوبہ اودھ کا حاکم تھا چلے آئے، یہاں دو سال رہے، قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز
گشت بہ اقطاع اودھ سرفراز

در اودم برد ز لطفے چناں
کیست کہ از لطف بتابد عناں

در اودھ از بخشش او تا دو سال
ہیچ غم و نالہ نبود از منال

امیر کی ماں ابھی تک زندہ تھیں، ماں کی محبت نے تقاضا کیا تو پھر دلی چلے آئے۔

کیقباد دلی کے تخت پر بیٹھکر عیاشی اور رندی میں پڑ گیا، یہ دیکھکر اس کے باپ بغرا خاں نے جو بنگال کا حاکم تھا۔ دلی کا رخ کیا، بیٹے نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا اور فوج لیکر چل کھڑا ہوا، راہ میں دونوں نے صلح کے پیام بھیجے اور صلح ہوگئی، امیر نے اس واقعہ پر دلچسپ قصیدہ لکھا۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد
زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد

کیقباد نے امیر سے فرمائش کرکے اس پر پوری مثنوی لکھوائی جس کا نام قران السعدین ہے، تین برس کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا، شاہی خاندان کی بساط الٹی اور سلطان جلال الدین فیروز خلجی دلی کے تخت پر بیٹھا، سلطان نے امیر کو اپنے مصاحبوں میں داخل کیا، امیر نے سلطان کے فتوحات کو نظم کیا اور تاج الفتوح نام رکھا۔

جلال الدین خلجی کے بعد ۶۹۵ھ میں علاء الدین خلجی نے جب دلی کے تخت پر قدم رکھا تو اس نے بھی امیر کی قدر کی، امیر نے اس کے فتوحات کی تاریخ خزائن الفتوح کے نام سے نثر میں لکھی، اسی کے زمانہ میں مثنوی لیلیٰ مجنوں تصنیف کی، ۷۱۶ھ میں قطب الدین خلجی نے جلوس کیا تو امیر نے اس کے لیے مثنوی نہ سپہر تصنیف کی، سلطان نے یہ قدر کی کہ ہاتھی برابر تول کر روپے شاعر کو انعام دیے، شاعر نے بادشاہ کی زبان سے کہا،

بہ تاریخ ہمچو من اسکندرے
کند ہر کہ آرایش دفترے

ز گنج گرانمایۂ بے شمار
دہم بار پیلش ز آں پیلبار

مرا خود دریں رہ پدر شد دلیل
کہ میداد زر ہم ترازوئے پیل

چو میراث شد پیل زر دادنم
نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم

شہا! گنج بخشا، کرم گسترا
معانی شناسا، سخن داورا

چنیں بخششے کز تو جم یافتم
در ایام پیشینہ کم یافتم

خلجی حکومت کے خاتمہ پر تغلق بادشاہوں کا دور دورہ ہوا، سلطان غیاث الدین تغلق نے بھی امیر کی قدردانی میں کمی نہ کی، امیر نے اس کے احسانات کا حق یہ ادا کیا کہ اسکے نام پر مثنوی تغلق نامہ لکھی، تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر بھی ساتھ گئے اور کچھ دنوں کے لیے وہیں رہ گئے، اسی اثنا میں امیر کے پیر سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کی وفات

کی خبر پہنچی، اپنے پیر کے عاشق تھے، جیسے بنا جلدی جلدی دلی پہنچے، اور جو کچھ زر و مال پاس تھا لٹا کر ماتمی کپڑے پہن خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو گئے، آخر چھ مہینے اسی حالت میں گذار کر ۷۲۵ھ میں وفات پائی اور پیر کے پائنتی جگہ ملی،

کہتے ہیں کہ امیر نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں اور چار لاکھ سے زیادہ اشعار کہے، پانچ دیوان یادگار ہیں، تحفۃ الصغر جس میں ۱۶ برس سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے، وسط الحیوۃ اس میں ۲۰ برس سے ۳۳-۳۴ برس تک کا کلام ہے، غرۃ الکمال میں ۳۴ برس کی عمر ۶۸۵ھ سے ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، بقیہ نقیہ میں بڑھاپے کا زور ہے، ۷۱۵ھ کا کلام ہے، نہایۃ الکمال پانچواں دیوان ہے، اس میں ۷۲۵ھ تک کا کلام ہے،

قران السعدین ان کی پہلی مثنوی ہے، اس کے بعد نظامی کے پنج گنج کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں، مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینۂ سکندری اور ہشت بہشت چار اور مثنویاں ہیں، نہ سپہر، دول رانی خضر خاں، تاج الفتوح اور تغلق نامہ، نثر میں تصوف میں افضل الفوائد، تاریخ میں خزائن الفتوح اور علم بدائع میں اعجاز خسروی یادگار ہیں،

امیر کا سب سے پہلا اور سب سے آخری کمال جامعیت ہے، یعنی

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری،

ان کی اس "جامعیت" کی تشریح مختلف حیثیتوں سے کی جا سکتی ہے،

۱- عام طور سے اہل ادب کی دو حیثیتیں ہیں، یعنی ایک نثر نویس اور دوسرے شاعر، شیخ سعدی کی طرح ایسے باکمال جو نثر و نظم دونوں اقلیمیں زیر فرمان رکھتے ہوں، کم ہیں، مگر امیر کا قلم سعدی کی طرح دونوں مملکتوں پر یکساں چلتا ہے، فرق یہ ہے کہ سعدی نثر میں بھی روانی اور سادگی کے بادشاہ ہیں اور امیر نثر میں صنائع، بدائع اور لفظی تکلفات کے امیر ہیں،

۲- شاعر زیادہ تر کسی ایک ہی زبان کے ہوتے ہیں، لیکن امیر مسعود سعد سلمان لاہوری کی طرح کئی زبانوں کے شاعر ہیں، وہ ہندی، فارسی، عربی تین زبانوں پر قدرت رکھتے تھے،

۳- شاعری کی تین صنفیں ہیں، مثنوی، قصیدہ اور غزل، عام طور سے فارسی کے شاعروں میں کسی ایک صنف میں کامل گذرے ہیں، جیسے فردوسی و نظامی مثنوی میں، خاقانی و انوری قصیدہ میں، اور سعدی و حافظ غزل میں، لیکن امیر کی جامعیت یہ ہے کہ وہ کلام کی ان تینوں صنفوں میں ممتاز ہیں،

۴- شاعر صرف شاعر ہوتا ہے، مگر ان کی ایک اور جامعیت یہ ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں، مورخ بھی ہیں، موسیقی کے ماہر بھی ہیں، صوفی بھی ہیں اور ندیم شاہی بھی،

۵- ان کی ایک اور جامعیت بھی ہے، شاعر یا خواص کے کام کا ہوتا ہے، جیسے عرفی و غالب، یا عوام کا ہوتا ہے، جیسے نظیر اکبر آبادی، مگر امیر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عوام و خواص دونوں کو گرویدہ کیے ہوئے ہیں، ایک طرف خواص کے لیے ان کا فارسی کلام ہے، دوسری طرف عوام کی دلچسپی کے لیے ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، دوہرے اور گیت ہیں،

۶- پھر لوگ یا تو دنیا داروں میں مقبول ہیں یا دینداروں میں، لیکن ایسے خوش نصیب شاعر کیا بلکہ انسان کم ہوں گے جن کے لیے تخت شاہی اور مسند فقر دونوں یکساں منتظر ہوں، ان کی زندگی کا تھوڑا سا حال آپ نے سنا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کی ساٹھ سال کی عمر کمال میں شاید ہی کوئی بدبخت بادشاہ ایسا گذرا ہو جس کو ان کی صحبت کے بغیر چین ملا ہو، دوسری طرف دینداروں میں ان کا یہ حال کہ سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدین نے مرنے کے بعد بھی ان کو اپنے سے علیحدہ کرنا پسند نہ فرمایا،

۷- اب میں ان کی جامعیت کا وہ آخری نقطہ بیان کرتا ہوں جس کی وسعت میں ہندستان

کہ ہندو، مسلمان دونوں قومیں سما گئی ہیں، یعنی وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندی اور ایرانی تمدنوں کو ملاکر ایک نئے ہندوستانی تمدن کا ڈھانچہ تیار کیا، ہندی کو عربی، فارسی، ترکی زبانوں سے ملاکر ایک نئی ہندوی یا ہندی یا ہندوستانی زبان کو پروان چڑھایا، جو اب اردو بن گئی ہے، ہندی اور فارسی شاعری کو ملاکر شاعری کے نئے نئے نمونے تیار کیے جو آدھے ہندو اور آدھے مسلمان ہیں،

یہی رنگ انھوں نے موسیقی میں نمایاں کیا، خالص ہندی راگ اور راگنیوں کو ایرانی موسیقی سے ترکیب دیکر مجیر، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، زیلف، فرغنہ، سرپردہ، باخرز، فردوست، منم وغیرہ ایسے راگ تیار کیے ہیں جو ہندی اور ایرانی حسنِ مذاق سے ترکیب دیکر بنائے گئے ہیں، جن سے متحدہ ہندوستانی موسیقی نے نیا جنم پایا،

شاعری کے صنف میں فارسی کے پہلو بہ پہلو ہندی گیت اور دوہرے وغیرہ کا دوسرا منظر ہے، جس میں ہندوستان کے دو تمدنوں کے دریاؤں کو جن کے دھارے الگ الگ بہہ رہے تھے ایک سنگم پر لاکر ملا دیا،

فارسی میں جیسا کہ میں نے پہلے کہا وہ مثنوی، قصیدہ اور غزل تینوں اصناف کے بادشاہ ہیں، خمسۂ نظامی کے جواب میں جتنی مثنویاں لکھی گئیں، ان میں سب سے کامیاب خسرو ہی کا پنج گنج ہے، فارسی مثنوی میں، رزم اور بزم کی دو مستقل بادشاہتیں ہیں، رزم کے فرمانروا فردوسی ہیں، اور بزم کے نظامی، امیر نے دونوں بادشاہتوں کو ملاکر ایک کر دیا، لیکن اس سلسلہ میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی بنا پر خسرو کی بڑائی مسلّم ہو جاتی ہے، فردوسی نے جس رزم میں، اور نظامی نے جس بزم میں کمال پیدا کیا وہ دونوں ان دنوں کی خیالی دنیا ہیں، یعنی انھوں نے اپنے خیال کے طلسمات سے دنیا بنا کر کھڑی کی تھی، اسلیے انھوں نے جس طرح چاہا اپنی خیالی دنیا کو بنا لیا، لیکن امیر نے پنج گنج کی خیالی

دنیاؤں کے ساتھ، تاج الفتوح، تغلق نامہ، دولرانی وخضر خاں میں اپنی نہیں خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی تصویر کھینچی ہے، دولرانی گو افسانہ ہے، مگر وہ ایک ایسی ہستی کی تصویر ہے جو امیر کی آنکھوں کے سامنے تھی، جس میں وہ کمی بیشی نہیں کر سکتے تھے، فردوسی و نظامی کیطرح ماضی کی دھندلی تصویریں نہیں، جن میں مصور کا قلم واقعات کے ردوبدل کا اختیار رکھتا ہے، امیر کی مثنویوں میں سے رزم و بزم کی ایک ایک تصویر آپکے سامنے ہے،

بگردوں شد از نای زریں خروش	بہ دریای لشکر در افتاد جوش
ہزاہز بر آمد بہ ہر دو سپاہ	روارو در آمد بہ خورشید و ماہ
علم سر ز عیوق بر تر کشید	سناں چشم سیارہ بر سر کشید
• بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت	جہانے پُر از شیر و شمشیر گشت
بدریاے آہن جہاں غرق شد	ہوا پُر ز میغ و زمیں پُر ز برق
گرہ برگرہ دشت پیکاں زناں	زرہ بر زرہ پشت روئیں تناں

یہ تو لڑائی کا ہمہمہ تھا، ذرا بزم کا سماں دیکھیے، مجنوں، لیلیٰ کے کہنے سے خطاب کرتا ہے،

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد	لیکن تو بنالۂ و من از درد
چوں باز گذر کنی درون کوی	بر خاک درش ز من نہی روی
ہر خس کہ بر و گذاشت گامے	از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن	زنہار بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز	یادش دہی از سگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش	از گردنِ من مکن فراموش

یہ تو مثنوی تھی، قصیدوں میں امیر کا کوئی خاص رنگ نہیں، کمال اسمٰعیل، خاقانی اور

انوری کی تقلید کرتے ہیں، اور جس کے جواب میں کہتے ہیں اسی کا رنگ بھرتے ہیں، خاقانی کے جواب میں

هر سو جوانان نوسلب، هر سو عروسان در قصب | طفلان نه خفته از طرب، دیده به فردا داشته

فاسق که ے نا خورده گه، در عیدگه بیهوده ره | سر بر بساط سجده گه، دل سوی صهبا داشته

واردی معلول است می، بل جان محلول است می | خورشید منحول است می در طاس مینا داشته

غزل امیر کی خاص چیز ہے، سعدی نے غزل کو غزل بنایا، اور امیر کی غزل گوئی حقیقت میں وہ سعدی کی شراب ہے جو امیر کے ہاں دوبارہ کھچکر اور تیز ہوگئی ہے۔ غزل کی جان درد، سوز وگداز، جذبات اور حسن وعشق کے دوسرے کاروبار ہیں۔ زبان سادہ، طرز ادا بے تکلف، بحریں چھوٹی، ترکیب میں الجھاؤ نہیں، خصوصیت کے ساتھ شاعرانہ تلمیح میں صوفیانہ حقیقتوں کی تعبیر امیر کی غزل گوئی کی مقبولیت کا راز ہے۔

•

سرے دارم کہ سامان نیست اورا | بہ دل دردے کہ درمان نیست اورا

فزاش کرد عمرم روز راز انک | شبے دارم کہ پایان نیست اورا

~~~~~~~~~~

ای دوست کہ بود بر کراں شد | واں صبر کہ داشتم نہاں شد

گفتم کہ اسیر گردی اے دل | دیدی کہ بعاقبت ہماں شد

~~~~~~~~~~

تو چہ دانی نیاز مندی چیست | چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

~~~~~~~~~~

خسرو است شب فسانۂ یار دہر بار | قدرے گریہ وپس بہ سر افسانہ رود

—— ✳ ——

ادبیات

غزل

از جناب روشؔ صدیقی

گلشن کی فضا بدل رہی ہے | بدمست صبا سنبھل رہی ہے

ٹوٹا ہے طلسم دور ونزدیک | منزل مرے ساتھ چل رہی ہے

وجدان کی چھاؤں تک پہنچکر | افکار کی دھوپ ڈھل رہی ہے

سنگیں، خموشیوں سے ہوکر | اک راہِ سخن نکل رہی ہے

آرایشِ حسن، لمحہ لمحہ | پیراہنِ گل بدل رہی ہے

لائی ہے پیامِ شوق کسی کا | رُک رُک کے نسیم چل رہی ہے

یکساں ہیں حیات کے شب وروز | اک شمع مدام جل رہی ہے

اے حسن ازل ہوئی بڑی دیر | کیوں عشق کی بات ٹل رہی ہے

پلکوں سے گرے روشؔ کچھ آنسو
کیا ہجر کی رات ڈھل رہی ہے

غزل

از جناب اعجاز احمد خاں صاحب حسب شاہجہانپور

یہی اک جہاں کیا، جہاں اور بھی ہیں | زمیں اور بھی، آسماں اور بھی ہیں
~~~~~~~~~~

جو اک کارواں لٹ گیا بھی تو کیا غم ۔۔۔ سرِ رہگذر کارواں اور بھی ہیں

وہ جن سے تھی امید چارہ گری کی ۔۔۔ مرے غم پہ وہ شادماں اور بھی ہیں

بلا سے مری پھونک دو آشیاں کو ۔۔۔ جہاں میں مرے آشیاں اور بھی ہیں

ستم کیش تنہا فلک ہی نہیں ہے ۔۔۔ ستم کے لیے آسماں اور بھی ہیں

شکستِ تمنا سے تھک کر نہ رہ جا ۔۔۔ ابھی راہ میں امتحاں اور بھی ہیں

جو اشکوں نے اظہار غم کر دیا ہے ۔۔۔ تو مجھ سے وہ اب بدگماں اور بھی ہیں

ہم اعجاز نکلے ہیں، ان کے سبب سے

ہمارے لیے آستاں اور بھی ہیں

غزل

از جناب کریم الرضا خاں صاحب وکیل شاہجہانپور

ہم اُنکی خوشی کے بندے ہیں ہم عشق کو رسوا کیا کرتے ۔۔۔ جب کوئی تمنا تھی ہی نہیں، اظہار تمنا کیا کرتے

وہ شوق طلب ہے شوق طلب جب تشنگی بقدر ظرف نہ ہے ۔۔۔ موسیٰ نے تقاضا کر دیکھا ہم ان سے تقاضا کیا کرتے

ہم کو یہ خوشی ہے او زاہد، ہم حد سے کبھی آگے نہ بڑھے ۔۔۔ ہم ان سے کرم کے سائل تھے ہم عشق کا دعوا کیا کرتے

کچھ بھی ہو مآلِ درد مگر جب درد ہوا نکھار درد تو پھر ۔۔۔ ہم چارہ گروں سے کیا کہتے ہم درد کا شکوا کیا کرتے

عرفانِ خودی سے بیگانے تسخیر مہ و انجم میں رہے ۔۔۔ جو خاک سے باہر جا نہ سکے، افلاک پہ قبضا کیا کرتے

خود ان کی فلک پیما حکمت زنجیر ہوس بنجاتی ہے

ورنہ یہ خرد کے دیوانے اللہ کی پروا کیا کرتے

مطبوعات جدیدہ

مسلم ثقافت ہندستان میں۔ مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۱۱، مجلد مع گرد پوش، قیمت عنہ پتہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

مسلمانوں نے اپنے ہزار سالہ عہد حکومت میں ہندوستان پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، اس کے علوم وفنون صنعت وحرفت، تہذیب وثقافت ہر چیز میں ان کے اثرات نمایاں ہیں، مگر آجکل ایک خاص ذہنیت کے ماتحت عمداً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی شاندار تاریخ کا محققانہ و منصفانہ جائزہ لیا جائے، یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی تہذیب پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا اور اس سے ہندوستانی تہذیب کس قدر بلند ہو گئی۔ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں قدیم ہندوستان کی سیاسی، جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، علمی اور ادبی حالت پر تبصرہ کیا گیا ہے، پھر یہاں اسلام کی آمد، اس کی بنیادی، اخلاقی اور ثقافتی تعلیمات، محمد بن قاسم کے ورود، سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور ظہیر الدین بابر کا ذکر ہے، اس باب میں لائق مولف نے ثابت کیا ہے کہ عرب تاجر اور سیاح قدیم زمانے سے ہندوستان آتے رہے ہیں اور محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ سے پہلے عرب تاجر اور جہاز راں جنوبی ہند میں آباد ہو چکے تھے، اور ان کے ذریعہ اسلام کی تعلیم ہندوستانیوں کے دلوں کو مسخر کر چکی تھی اور محمود غزنوی جس کو آج کل راہزن اور ڈاکو ثابت کیا جا رہا ہے، ایک پاکباز، نیک طینت، رواداری، بلند اخلاق اور بہادر بادشاہ تھا، پھر سلاطین ہند کے طرز حکومت، فوجی نظام

صوبجاتی نظم ونسق، علم پروری، ان کے عہد کے صوفیہ، علماء، اصحاب سیر و تاریخ اطبا اور شعرائے فارسی وغیرہ کے حالات ہیں، ایک باب میں فنون لطیفہ کا ذکر ہے جس میں باغات، تعمیرات، مصوری، خطاطی اور موسیقی سے مسلمانوں کی دلچسپی اور اس میں انکا درجہ دکھایا گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی طرز معاشرت، حیوانات کی پرورش، مردانہ کھیلوں، مکان ولباس، ساز وسامان اور انواع و اقسام کے کھانوں کی تفصیل ہے، ایک باب مسلمانوں کی رواداری اور ہندوؤں کے ساتھ ان کے حسن سلوک کے لیے مخصوص ہے، اور ہندوستان کی مختلف زبانوں پر فارسی کے اثرات، فارسی اور اردو کے ہندو شعراء و مصنفین کا ذکر ہے، اس بحث میں اردو کو مسلمانوں کا بہترین ثقافتی تحفہ قرار دیا گیا ہے، نویں باب میں حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندان ولی اللّٰہی کی علمی و تجدیدی خدمات، سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی تعلیمی و اصلاحی کوششوں اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخری باب میں مسلمانوں کے دور حکومت میں عوامی اور پبلک زندگی کی کیفیت و حالت بیان کی گئی ہے، جس سے مسلمان سلاطین کی داد و دہش، رعایا پروری اور حسن انتظام کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب کا صرف سرسری خاکہ ہے ورنہ اسکا ہر باب بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے، اور اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ اور مسلم ثقافت کا پورا نقشہ مطالعہ ہی سے سامنے آسکتا ہے، کتاب کا ہر صفحہ مصنف کی محنت، تلاش و تحقیق اور حسن مذاق کا آئینہ دار ہے، اور ان کا نام ہی ان خوبیوں کی پوری ضمانت ہے اور وہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں، یہ کتاب ہندوستان کی مشترک تہذیب سے تمام دلچسپی رکھنے والوں خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور پروفیسروں کے مطالعہ کے لائق ہے،

سیرت سید احمد شہید۔ از مولانا ابو الحسن علی ندوی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۹۰ مجلد مع گردپوش قیمت [illegible]، ناشر خواجہ بک ڈپو، اردو بازار لاہور،

یہ مولانا ابو الحسن علی کی مشہور و مقبول تالیف "سیرت سید احمد شہید" کے چوتھے ایڈیشن کا پہلا حصہ ہے،

جس میں حضرت سید صاحب کی ولادت سے بیعت امامت تک کے واقعات اور حالات ہیں، معارف میں اس کے پہلے ایڈیشنوں پر مفصل تبصرہ ہو چکا ہے، یہ نیا ایڈیشن فاضل مولف کی بعض نئی تحقیقات جدید معلومات اور متعدد تاریخی دستاویزوں اور نقشوں پر مشتمل ہے جس سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے، صاحب سوانح کی زندگی سراپا یقین و ایمان، اخلاص و عمل اور ہمت و جہاد سے عبارت ہے، اور خود مؤلف کی شخصیت بھی بڑی پاکیزہ اور پر اثر واقع ہوئی ہے، ان خصوصیات کے ساتھ مصنف کی ستھری زبان اور شیریں بیانی نے اس میں بڑی حلاوت اور دلآویزی پیدا کر دی ہے، توقع ہے کہ یہ ایڈیشن بھی پہلے کی طرح مقبول ہوگا۔

نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری از مولانا عبد الرؤف رحمانی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، قیمت [illegible]، پتہ عبد الرؤف رحمانی معرفت تبارک اللہ بڑھنی بازار، پوسٹ دامدت گنج، ضلع بستی،

صحیح بخاری حدیث کی کتابوں میں سب سے زیادہ اہم اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانی جاتی ہے، اس رسالہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کی اسی حیثیت کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، اور امام بخاری کے غیر معمولی علم و فضل، بے مثال قوت حافظہ، اخذ حدیث میں اہتمام بخاری کی ترتیب و تصنیف میں حزم و احتیاط، اس کی توثیق کے متعلق اکابر محدثین اور ائمہ فن کے اقوال نیز اس کی معلقات، متابعات، مسندات اور اسی قبیل کی دوسری خصوصیتوں کا ذکر ہے، جن سے اسکا اصح الکتب ہونا ثابت ہوتا ہے، شروع میں مولانا محمد اسمٰعیل گجرانوالہ کا مقدمہ اور لائق مؤلف کے قلم سے اسناد و روایات پر مبسوط تبصرہ بھی ہے۔ البتہ کہیں کہیں بیان میں مبالغہ ہو گیا ہے، اور انداز تحریر موجودہ مذاق سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن رسالہ محنت اور نیک نیتی کیساتھ لکھا گیا ہے، اس زمانہ میں حدیث کے متعلق جو عام افراط و تفریط پیدا ہو گئی ہے اس لحاظ سے اسکا مطالعہ مفید ہوگا،

شعر و ادب۔ از جناب اختر علی تلہری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۵

مجلد مع گرد پوش، قیمت ہے رہتے (۱) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۲) فروغ اردو،

امین آباد پارک لکھنؤ (۳) مکتبہ فکر و ادب نمبر ۱۶۹ گولہ گنج لکھنؤ۔

یہ مصنف کے آٹھ ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، وہ ایک دیدہ ور اہل قلم ہیں، انھوں نے ترقی پسند ادب کے بعض غلط نمایندوں نے قدیم سرمایۂ شعر و ادب کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں ان کا بڑی خوبی سے ازالہ کیا ہے، اور شروع کے تین مضامین اس حیثیت سے بڑے مفید اور قابل قدر ہیں، ان کے مضامین میں فکری جدت بھی پائی جاتی ہے، آثر کی غزلیہ شاعری پر ان کا مقالہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ آثر جیسے باکمال شاعر کو ہمارے نقاد ابتک نظرانداز کیے ہوئے ہیں، موازنۂ مومن و غالب اور مسدس حالی میں البتہ کچھ غیر متوازن باتیں آگئی ہیں، خصوصاً مسدس حالی کے متعلق ان کی رائے عجیب اور محل نظر ہے مولوی عبد الحق صاحب نے اگر انیس سے حالی کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں غریب حالی کا کیا قصور کہ اس کی سزا اس کو دیجائے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ مجموعہ علمی و ادبی حیثیت سے ارباب ذوق کے پڑھنے کی چیز ہے،

رزم نامۂ انیس۔ مرتبہ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،

صفحات ۲۰۰ قیمت ہے رہتے کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ،

انیس مرحوم کے مرثیوں کا موضوع کربلا کے روح فرسا واقعات ہیں اسلیے ان میں رزمیہ شاعری کا بڑا عنصر ہے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے جو انیس پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، انیس کی رزمیہ شاعری کو مرثیہ سے الگ کر کے رزم نامۂ انیس کے نام سے مرتب کیا ہے، انیس نے جس میدان میں بھی قدم رکھا اسکو کمال تک پہنچا دیا، انکا رزمیہ کلام بھی اس کمال کا نمونہ ہے، اسکو پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود میدان جنگ میں کھڑا ہے، کلام انیس کے اعلیٰ محاسن ان نظموں میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں، اور لائق مرتب نے اس خوش اسلوبی سے اسکو الگ کیا ہے کہ ربط اور تسلسل بیان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اردو میں رزمیہ شاعری کی بڑی کمی ہے، اس انتخاب سے اس پر ایک مستقل کتاب ہوگئی ہے، کتاب مرتب کر کے فاضل مرتب نے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

'ض'